ملک صفدر حیات (سیریز نمبر 38)
طاقتور
(تحریر حسام بٹ)
سسپنس
ڈائجسٹ
اگست
2017
عقیل قریشی - پاسر حسنین - محمد سجاد بھٹی
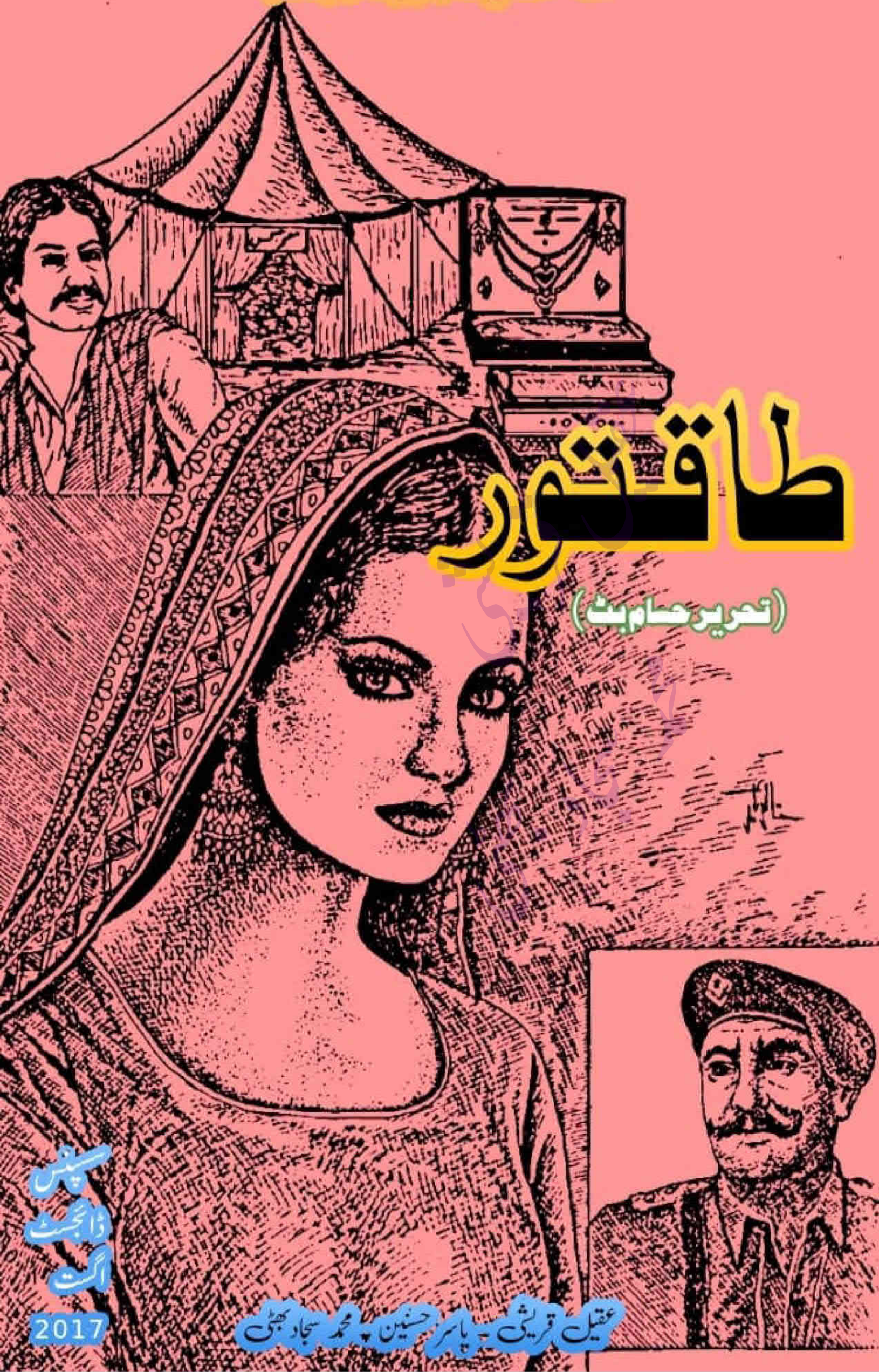
طاقتور

ملک صفدر حیات

لالچ اور طمع کسی بھی نوعیت کا ہو انسان کی عقل پر پردے ڈال دیتا ہے... کوئی عشق میں اندھا اور کوئی دولت کے لیے پاگل... انسان مفاد میں کبھی عزت سے کھیلتا ہے اور کبھی زندگی سے... وہ دونوں بھی جب والدین کی عزت کو خاک میں ملا کر نکلے تو خود بھی خاک میں مل گئے اور طاقت کے گھمنڈ میں کوئی تیسرا شخص اس خونی واردات میں بازی لے گیا مگر... لاکھ تدبیروں کے باوجود ناحق بہنے والا خون خود ہی قاتل کا پتا دے جاتا ہے بشرطیکہ منصف کے ہاتھ میں ترازو اپنا توازن قائم رکھے اور... ملک صفدر جیسے اصول پسند لوگ اس توازن کو قائم رکھنے کے لیے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ لہٰذا انصاف تو ہونا ہی تھا مگر کچھ معاملات میں انصاف ملنے کے بعد بھی انسان خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔

عزت کا جنازہ نکالنے والے نام نہاد عاشقوں کے جنازوں کا عبرت انگیز واقعہ

اکلوتی اولاد کے والدین بہت جذباتی ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اگر یہ اولاد بیٹی ہو اور وہ بھی بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی ہو تو پھر والدین کی حساسیت اور جذباتیت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے اور اسی جذباتی وابستگی کے سبب وہ بیٹی کی شادی کے سلسلے میں دانستہ تاخیری حربے اختیار کرنے لگتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں، اگر بیٹی بیاہ کر دوسرے گھر چلی گئی تو وہ تنہا رہ جائیں گے۔ تنہائی کے اسی احساس سے ڈر جانے والے والدین بعض اوقات بڑی سیاست سے کام لیتے ہیں۔ وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر کوئی ایسا لڑکا تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہوتا کہ اسے بہ آسانی گھر داماد بنایا جا سکے۔ اس طرح ان کے جگر کا ٹکڑا یعنی ان کی بیٹی ہمیشہ ان کی نظروں کے سامنے رہتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ایسا سوچنا یا ایسا کرنا غلط ہے یا درست، میرے خیال میں اگر باہمی رضامندی سے کسی والدین کو اپنی بیٹی کے لیے ایسا کوئی گھر داماد لڑکا مل جاتا ہے تو اس میں کوئی برائی بھی نہیں۔

ان کو بھی اپنی بیٹی کے لیے ایک ایسا ہی شوہر چاہیے تھا جو گھر داماد بن کر رہنے کو تیار ہو۔ وہ کافی عرصے سے کسی ایسے ہی شخص کی تلاش میں تھے۔ قبل اس کے کہ ان کی محنت رنگ لاتی، ان کی اکلوتی اولاد گھر سے غائب ہو گئی تھی۔

وہ گندم کی کٹائی کا موسم تھا۔ ایک روز حسبِ معمول میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو لڑکی کی گمشدگی کا ایک کیس میرا منتظر تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک کانسٹیبل نے میرے پاس پہنچ کر بتایا۔

''ملک صاحب! یہ لوگ کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

کانسٹیبل کے ''یہ لوگ'' کا مطلب میں بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔ اس کا اشارہ ان دو افراد کی طرف

تھا جو باہر برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک مرد اور دوسری عورت تھی۔ جب میں اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو ان پر میری نگاہ پڑی تھی۔

میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''معاملہ کیا ہے؟''

''ان کی جوان بیٹی گھر سے غائب ہو گئی ہے۔'' مذکورہ کانسٹیبل نے بتایا۔ ''وہ اسی سلسلے میں آپ کے پاس آئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم انہیں اندر بھیج دو۔'' میں نے کہا۔ ''اور میرے لیے ٹھنڈا پانی بھی۔''

وہ بڑے ادب سے گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے میرے کمرے سے نکل گیا۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح فریج کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ لفظ ''رواج'' کو اگر ''ضرورت'' سے بدل دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ آج کل جہاں تک بجلی کی رسائی ہے وہاں ضروریاتِ زندگی کی تقریباً تمام اشیا پہنچی ہوئی ہیں جیسے ٹی وی، فریج، کیبل لیکن جس زمانے کا یہ قصہ ہے، اس وقت گاؤں دیہات میں فریج کا کوئی تصور نہیں ہوتا تھا۔ موسم گرما میں ٹھنڈے پانی کے حصول کے لیے مٹی کے گھڑے اور مٹکے وغیرہ استعمال کیے جاتے تھے۔ ہمارے تھانے میں بھی ٹھنڈے پانی کی فراہمی کا یہ بندوبست موجود تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے پانی کا گلاس اور فریادی جوڑا میرے کمرے میں موجود تھے۔ میں نے اپنی میز کے سامنے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''بیٹھ جاؤ......!''

لمحاتی تذبذب کے بعد وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ان کے انداز سے پریشانی مترشح تھی۔ کانسٹیبل کی زبانی مجھے اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی گمشدگی کے سلسلے میں تھانے آئے ہیں۔ بیٹھنے کے بعد وہ اضطراری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ غالباً ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں۔ میں نے ان کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

''جی بتائیں...... آپ لوگوں کا کیا مسئلہ ہے؟''

سوالیہ انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے میں نے ٹھنڈے پانی کا گلاس خالی کر دیا۔ مرد نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''تھانے دار صاحب! میرا نام غلام سرور ہے اور یہ میری بیوی آسیہ ہے۔'' اس نے اپنی ساتھی عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''ایک پریشانی ہمیں کھینچ کر آپ کے پاس لے آئی ہے۔''

''تمہاری جوان بیٹی گھر سے غائب ہو گئی ہے...... ہیں نا؟'' میں نے باری باری ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''گھر سے نہیں تھانے دار صاحب۔'' آسیہ بی بی روہانسی ہو گئی۔ ''وہ تو گھر پہنچی ہی نہیں...... ہم اس کا انتظار کرتے رہ گئے۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی اور اب ہم...... آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔''

یہ بات مجھے کانسٹیبل نے بتائی تھی کہ ان کی جوان بیٹی گھر سے غائب ہو گئی تھی۔ بہرحال، گھر سے یا کہیں باہر سے...... ان کی بیٹی گم ہو چکی تھی۔ غلام سرور نے امداد طلب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! ہم زیبو کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔ آپ کسی بھی طرح ہماری بیٹی کو ڈھونڈ نکالیں ورنہ اس کی ماں رو رو کر اپنی آنکھیں اندھی کر بیٹھے گی۔''

''پریشانی تو تم دونوں کے چہروں سے جھلک رہی ہے۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ تمہاری بیٹی کب اور کہاں سے غائب ہوئی ہے۔ جب تک پوری بات مجھے پتا نہیں چلے گی، میں آپ لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔''

وہ دونوں گھبرا کر سراسیمہ نظروں سے مجھے تکنے لگے۔ غلام سرور لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! آپ ایسا تو نہ کہیں۔ ہم بہت آس امید لے کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ زیبو کل رات سے غائب ہے...... اوپر خدا اور نیچے آپ ہی ہیں جو زیبو کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔''

''میں تمہاری آس اور امید کو توڑ نہیں رہا......'' میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں تھانے میں آلو پیاز کی آڑھت کرنے نہیں بیٹھا ہوں۔ میرے محکمے نے آپ لوگوں کی دادرسی کے لیے ہی مجھے یہاں تعینات کیا ہے۔ میرے تھانے کی حدود میں جو بھی واقعہ رونما ہوگا اسے میں نے ہی دیکھنا ہے لیکن جب تک مجھے کسی معاملے کے پس منظر کا علم نہیں ہوگا، میں صحیح خطوط پر کوئی کوشش نہیں کر سکوں گا۔ آپ لوگ میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟''

''جی...... جی......'' غلام سرور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''میں سمجھ گیا جناب۔ میں آپ کو

بتاتا ہوں۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانے لگا۔

''زبیدہ عرف زیبو گزشتہ روز اپنی سہیلیوں کے ہمراہ میلے کی رونق دیکھنے گئی تھی۔ شام تک اس کی سہیلیاں تو واپس اپنے گھروں کو پہنچ گئیں لیکن زیبو ابھی تک غائب ہے۔ ہمارے اختیار میں جو تھا وہ ہم نے کیا لیکن زیبو کی تلاش میں ہمیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ پچھلی رات ہم نے بڑی اذیت میں گزاری ہے۔ صبح کسی سیانے نے مشورہ دیا کہ ہمیں تھانے جا کر اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانا چاہیے۔ اس بندے کا مشورہ ہماری سمجھ میں آگیا اور ہم آپ کے پاس چلے آئے ہیں......''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ غلام سرور کی بیان کردہ کہانی ہر لحاظ سے نامکمل تھی۔ زبیدہ عرف زیبو کی تلاش کے لیے یہ معلومات کافی نہیں تھیں۔ وہ دونوں اس قدر پریشان تھے کہ کام کی باتیں اگلوانے کے لیے ان کا ایک بھرپور انٹرویو ضروری تھا لہٰذا میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے غلام سرور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ لوگوں نے زیبو کی ان سہیلیوں سے پوچھ تاچھ کی جن کے ہمراہ وہ میلے کی رونق دیکھنے گئی تھی؟''

غلام سرور کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا جبکہ اس کے مقابلے میں آسیہ بی بی کو ہیوی ڈیوٹی کہا جاسکتا تھا۔ آسیہ بی بی ایک موٹی تازی اور خوبصورت عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتالیس کے اریب قریب لگایا۔ بعدازاں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ چھیالیس سال کی تھی۔ ان کی گمشدہ بیٹی زیبو کی عمر چوبیس سال تھی۔

''ہم نے باری باری سب لڑکیوں سے زیبو کے بارے میں پوچھ لیا ہے۔'' غلام سرور نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''لیکن زیبو کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ اس کی دونوں سہیلیاں اپنے اپنے گھروں کو پہنچ گئی ہیں اور ہم ابھی تک زیبو کی راہ تک رہے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''زیبو کی ان دو سہیلیوں کے نام کیا ہیں؟''

اس بار آسیہ بی بی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''ایک کا نام رفعت ہے اور دوسری کا نام فریدہ ہے۔''

''فریدہ اور رفعت نے زیبو کی گمشدگی پر کیا کہا ہے؟'' میں نے براہِ راست آسیہ بی بی سے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، ان کے خیال میں زیبو کہاں جاسکتی ہے؟''

''ان کا کہنا ہے کہ واپسی پر زیبو اپنی گلی میں داخل ہو گئی تھی۔'' آسیہ بی بی نے جواب دیا۔ ''اس کے بعد وہ دونوں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں۔ ہمیں بھی اس بات پر شدید حیرت ہے کہ زیبو جب اپنی گلی میں داخل ہو گئی تھی تو پھر گھر کیوں نہیں پہنچی۔ وہ دونوں زیبو کے لیے بہت پریشان ہیں۔''

''آسیہ بی بی! تمہاری باتوں سے میں یہ سمجھ پایا ہوں کہ رفعت اور فریدہ تمہاری گلی میں نہیں رہتیں۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اسی لیے وہ میلے سے واپسی پر زیبو کو اس کی گلی میں داخل کر کے آگے بڑھ گئی تھیں؟''

''جی...... جی ہاں!'' وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''وہ دونوں منڈھورا کلاں ہی میں رہتی ہیں لیکن ان کے گھر دوسری گلیوں میں ہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے سانس کو ہموار کیا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''فریدہ کا گھر ہماری عقبی گلی میں ہے۔ یوں سمجھیں کہ ہمارا گھر فریدہ کے گھر کے ساتھ پچھواڑے سے ملا ہوا ہے۔ دونوں گھروں کی چھتیں آپس میں ملے ہونے کی وجہ سے بہ ذریعہ چھت دونوں سہیلیاں بہ آسانی ایک دوسرے کے گھر میں آتی جاتی رہتی ہیں جبکہ رفعت کا گھر دو گلیاں چھوڑ کر ہے۔''

پھر غلام سرور نے مجھے بتایا کہ رفعت کی تین سال پہلے شادی ہو گئی تھی۔ اس کا دو سال کا ایک بیٹا ہے۔ یہ بچہ دو سال پہلے عید کے دن پیدا ہوا تھا لہٰذا اس کا نام عید محمد رکھ دیا گیا جو بگڑ کر عیدو ہو گیا۔ رفعت کے شوہر کا نام مشتاق محمد تھا۔ وہ کوٹ کشال نامی گاؤں میں رہتا تھا۔ آج کل رفعت اپنے میکے منڈھورا کلاں آئی ہوئی تھی۔ کوٹ کشال میں مشتاق کریانے کی دکان چلاتا تھا۔

میں نے غلام سرور سے پوچھا۔ ''کیا زیبو کی شادی ہو چکی ہے؟''

یہ سوال میں نے ایک خاص مقصد سے پوچھا تھا ورنہ اب تک جو حالات میرے علم میں آچکے تھے ان کی روشنی میں بڑے واضح انداز میں دیکھا جاسکتا تھا کہ گمشدہ زیبو غیر شادی شدہ تھی۔

غلام سرور نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''نہیں جناب۔''

''کیا وہ منگنی شدہ ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

اس نے ایک بار پھر نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ ''اس کی کہیں بات وغیرہ چل رہی تھی؟''

''ابھی تک اس قسم کا کوئی باقاعدہ سلسلہ شروع نہیں

ہوا تھا۔'' اس نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔
''سلسلہ تو شروع ہو ہی جاتا لیکن زیبو کے باپ کی وجہ سے معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔'' آسیہ بی بی نے شکایتی نظر سے غلام سرور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''غلام سرور کی وجہ سے کیوں؟'' میں نے خاصے تیز لہجے میں سوال کیا۔
آسیہ بی بی کی بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر غلام سرور کی جانب دیکھا اور میرے سوال کے جواب میں بتایا۔
''پچھلے چار سال میں پانچ چھ گھروں سے زیبو کے رشتے آئے ہیں مگر غلام سرور نے صاف انکار کر دیا۔''
''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے باری باری ان دونوں کی جانب دیکھا۔ ''لوگ تو اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں جو کسی اچھی جگہ سے بیٹی کا رشتہ آ جائے؟''
''غلام سرور کہتا ہے، زیبو تو ابھی بچی ہے۔ اس کی شادی کی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔'' آسیہ بی بی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔
''ہاں...... میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔'' غلام سرور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''میری نظر میں زیبو ابھی کم سن ہے......'' بولتے بولتے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر اپنی نم آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا۔
''آہ...... میری زیبو کہاں چلی گئی...... میں اسے کدھر تلاش کروں......!''
زیبو، غلام سرور کی اکلوتی اولاد تھی اور اکلوتی اولاد کے حوالے سے میں نے اس کہانی کے ابتدائیہ میں اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب غلام سرور کی حالت قدرے سنبھل گئی تو میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
''غلام سرور! اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، کیا اس سے پہلے بھی کبھی زیبو گھر سے غائب ہوئی ہے؟''
''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں جواب دیا۔ ''ایسا واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا۔''
''تم لوگوں کی کسی سے کوئی خار بازی تو نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ہرگز نہیں جناب۔'' اس نے پوری قطعیت سے جواب دیا۔ ''ہماری کسی سے کوئی دشمنی نہیں جو زیبو کی گمشدگی کو اس تناظر میں دیکھا جائے۔''
''تمہارے دوسرے رشتے دار کہاں رہتے ہیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔
''میرا مطلب ہے، منڈھورا کلاں کے علاوہ......؟''
اس نے آلے دوالے کے تین چار گاؤں کے نام گنوا دیے اور کہا۔ ''ہمارے تمام رشتے دار انہی گاؤں میں آباد ہیں۔''
''کیا زیبو انہی میں سے کسی رشتے دار کے گھر تو نہیں چلی گئی؟'' میں نے ایک امکانی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانے دار صاحب!'' وہ پُروثوق لہجے میں بولا۔ ''وہ ہمیں بتائے بغیر یوں خاموشی سے اکیلی نہیں جا سکتی اور وہ بھی شام کے وقت...... ناممکن۔ ویسے بھی یہ سارے پنڈ منڈھورا کلاں سے کافی فاصلے پر ہیں۔''
''یہ میرے پیشے کا تقاضا ہے کہ مجھے اپنے پاس آنے والے مصیبت زدہ افراد سے ہر نوعیت کے سوالات پوچھنا پڑتے ہیں لہٰذا میری کسی بات کا بُرا منانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے باری باری دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لینے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر غلام سرور کی بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔
''آسیہ بی بی! میں تم سے ایک انتہائی نازک سوال کرنا چاہتا ہوں، امید ہے، تم سچا اور کھرا جواب دو گی......!''
وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔
''آپ پوچھیں تھانے دار صاحب۔ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔''
''کیا زیبو کسی لڑکے کو پسند کرتی تھی؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔
وہ دونوں ہراساں نظروں سے مجھے تکنے لگے۔ میں نے ان کے اطمینان کی خاطر کہا۔ میرے سوال نے انہیں مضطرب کر دیا تھا۔
''میں یہ سوال کرنے کے لیے مجبور ہوں لیکن آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت ہمارے بیچ میں جو بھی گفتگو ہو رہی ہے، اس کا تذکرہ کسی چوتھے تک نہیں پہنچے گا۔''
''تھانے دار صاحب! میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر یہ کہنے کو تیار ہوں کہ زیبو کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ وہ کسی بھی لڑکے کو نہیں چاہتی تھی۔''
میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا

گاؤں کا کوئی لڑکا زیبو کو پسند کرتا تھا؟''

''تھانے دار صاحب!'' غلام سرور نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''ہماری زیبو کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں تھا کہ وہ کسی سے یا کوئی اس سے پیار کی پینگیں بڑھا رہا ہو۔ ہاں، جیسا کہ آسیہ نے آپ کو بتایا ہے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''زیبو کے باقاعدہ کئی گھروں سے رشتے آتے رہے ہیں لیکن ان میں سے کوئی میرے معیار پر پورا نہیں اترا اس لیے میں نے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم نے ہونے والے داماد کے لیے اپنے ذہن میں کیا معیار قائم کر رکھا ہے؟''

''بس جی، وہ محنتی ہو، میری زیبو کو کما کر کھلا سکے۔ اس کا خیال رکھ سکے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور......!''

وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے کہا۔ ''کیا اب تک زیبو کے جتنے بھی رشتے آئے ہیں وہ تمام لڑکے نکھٹو اور ہڈحرام تھے جو تم نے انہیں اپنی فرزندی میں لینے سے انکار کر دیا؟''

''ایسی بات نہیں ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''پھر کیسی بات ہے؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ''تھوڑی دیر پہلے 'اور' پر پہنچ کر تمہارے ریکارڈ کی سوئی پھنس کیوں گئی تھی۔ تم مجھے کیا بتانا چاہ رہے تھے جو اچانک رک گئے......!''

''وہ جناب...... میں یہ کہہ رہا تھا کہ......'' وہ ندامت آمیز انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ایسے داماد کی تلاش میں ہوں جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو یا پھر وہ انتہائی مختصر خاندان رکھتا ہو۔ دراصل، میں زیبو کو اپنی نگاہ سے دور نہیں کرنا چاہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ بیاہ کر مجھ سے دور ہو گئی تو میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔''

اپنی بات کے اختتام پر وہ بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ اس کے مسئلے کو سمجھنے میں مجھے کسی قسم کی کوئی دقت یا دشواری محسوس نہ ہوئی۔ اس کی خواہش کی تہ میں اترنے کے بعد میں نے کہا۔

''تو سیدھی طرح یہ کہو نا کہ تمہیں ایک ایسے لڑکے کی تلاش ہے جو گھر داماد بن کر رہنے کے لیے تیار ہو......؟''

''جی...... جی......'' وہ بڑی سرعت سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔''

غلام سرور کی خواہش کسی بھی زاویے سے غیر اخلاقی یا غیر قانونی نہیں تھی، لہٰذا میں نے اس کی منصوبہ بندی پر کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ زیبو کی گمشدگی کے حوالے سے میں نے ممکنہ سوالات ان میاں بیوی سے پوچھ لیے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ابھی تک اس کیس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں لگا تھا جسے تھام کر میں دوسرے سرے تک پہنچنے کی کوشش کرتا جہاں زیبو سے میری ملاقات ہو جاتی۔

''آپ لوگ قطعی پریشان نہ ہوں۔'' میں نے باری باری ان دونوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی بیٹی کو بازیاب کرنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ...... زیبو بہت جلد آپ تک پہنچ جائے گی لیکن اس کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو مجھ سے بھرپور تعاون کرنا ہو گا۔''

''ہم ہر تعاون کے لیے تیار ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ یک زبان ہو کر فدویانہ انداز میں بولے۔ ''آپ حکم کریں، ہمیں کیا کرنا ہے......؟''

''اول...... آپ اپنے ان تمام رشتے داروں سے رابطہ کر کے زیبو کے بارے میں معلومات حاصل کریں جن کے پاس اس کے جانے کے امکانات ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے انہیں ہدایت کی۔ ''دوم...... زیبو اپنی جن دو سہیلیوں کے ساتھ میلا دیکھنے گئی تھی، آپ کو ان دونوں کے بیانات کا بندوبست کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں رفعت یا فریدہ کی زبان سے کوئی ایسی بات اگلوانے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا جو زیبو کی تلاش کے سلسلے میں مددگار ثابت ہو گی۔ تم ان دونوں خواتین کو تھانے تک لانے کا انتظام کر لو گے؟''

میں نے یہ سوال براہ راست غلام سرور سے کیا تھا۔ لہٰذا جواب بھی اسی نے دیا۔ ''جی سرکار! میں یہ کام کر لوں گا۔ آپ اس سلسلے میں بے فکر ہو جائیں۔ سمجھ لیں کہ یہ میری ذمے داری ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں تم اس ذمے داری کو کس طرح نبھاتے ہو......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا...... ''غلام سرور! تم کرتے کیا ہو؟''

''میرا ذاتی کام ہے جی۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس ذاتی کام کی نوعیت کیا ہے؟''

''میں بوتلوں کا کام کرتا ہوں تھانے دار صاحب۔''

پھر میرے استفسار پر غلام سرور نے مجھے ''بوتلوں والے کام'' کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے اپنے گھر میں دیسی کولڈ ڈرنکس بھرنے کی مشین لگا رکھی تھی۔ دیسی کولڈ ڈرنکس سے مراد وہ بوتلیں ہیں جو کسی نہ کسی برانڈ کے ذائقے کی نقل ہوتی ہیں اور اصل بوتل سے یہ آدھی قیمت پر مل جاتی ہیں۔ غلام سرور اپنے گھریلو پلانٹ پر جو بوتلیں بھرتا تھا ان کے نام کچھ اس طرح تھے...... لیمن، روز اپ، ومٹو وغیرہ۔ غلام سرور اپنے گھر میں یہ بوتلیں بھرتا تھا پھر بوتلوں والے ڈالے (کریٹ) سائیکل پر لاد کر مختلف دکانوں پر سپلائی کرتا تھا۔

میں نے غلام سرور اور اس کی بیوی آسیہ کو تسلی دی کہ میں بہت جلد ان کی بیٹی زیبو کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ وہ دونوں میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں زیبو کی گمشدگی کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ان دونوں میاں بیوی سے مجھے جس قدر معلومات حاصل ہوئی تھیں ان سے میری تشفی نہیں ہو سکی تھی۔ ان معلومات کی روشنی میں زیبو تک رسائی حاصل کرنا ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس زنجیر کی بہت سی کڑیاں بیچ میں سے غائب تھیں۔

غلام سرور نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ زیبو کی دونوں سہیلیوں رفعت اور فریدہ کو میرے پاس لے کر آئے گا۔ مجھے امید تھی کہ یہ دونوں خواتین زیبو کے حوالے سے کچھ نہ کچھ ایسا ضرور جانتی ہوں گی جو اس کی تلاش میں میری مدد کر سکتا تھا۔

☆☆☆

راحت کی عمر کم اور تکلیف کا دورانیہ ہمیشہ طویل ہوتا ہے۔ یہی فارمولا موسموں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ پاکستان میں پائے جانے والے موسموں میں موسم گرما کے دن طویل اور موسم سرما کے دن خاصے مختصر ہوتے ہیں۔ موسم سرما میں دن کا آغاز ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد پتا چلتا ہے کہ رات کی آمد آمد ہے جبکہ موسم گرما کے دن کو گزارنا، پہاڑ کاٹنے کے مترادف ہے۔

سہ پہر کے بعد میرے جی میں آئی کہ منڈھورا کلاں جا کر وہاں کے حالات کا جائزہ لوں۔ غلام سرور اور آسیہ بی بی کی فراہم کردہ معلومات اس معاملے کو آگے بڑھانے کے لیے کافی نہیں تھیں۔ تھانے میں فوری نوعیت کی کوئی مصروفیت نہیں تھی لہٰذا میں نے ایک تانگا منگوایا اور ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر موضع منڈھورا کلاں روانہ ہو گیا۔

ان دنوں میری تعیناتی رسول پور تارڑ کے تھانے میں تھی۔ رسول پور تارڑ نامی یہ قصبہ حافظ آباد اور پنڈی بھٹیاں کے درمیان واقع ہے۔ منڈھورا کلاں، کولھوال، کوٹ کشال، سلطان پورہ، قمس آباد اور چک جنجوعہ میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے۔ ہم ایک نہر کے کنارے سفر کرتے ہوئے منڈھورا کلاں پہنچ گئے۔

غلام سرور کا گھر گاؤں کے وسط میں تھا۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اس میلے کا ایک طائرانہ نظارہ بھی کر لیا جس کا ذکر غلام سرور نے کیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق، یہ میلا ہر سال مئی کے مہینے میں گاؤں سے باہر ایک کھلے میدان میں لگا کرتا تھا جو کئی دن تک جاری رہتا تھا۔ عام دنوں میں یہ وسیع و عریض میدان بچوں کے کھیل کود کے لیے استعمال ہوتا تھا جس میں فٹ بال، والی بال، پتنگ بازی اور دیگر معروف دیہاتی کھیل کھیلے جاتے تھے۔

غلام سرور کا گھر تین کمروں پر مشتمل تھا۔ دو کمرے گھر کے پچھلے حصے میں پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ ان کے آگے ایک طویل برآمدہ تھا۔ برآمدے کے بعد ایک کشادہ صحن تھا جس میں آم اور امرود کے درخت استادہ تھے۔ صحن کے ایک کونے میں برآمدے سے ملحقہ ایک ''اوپن کچن'' بنا ہوا تھا۔ اوپن کچن کے الفاظ سے آپ کہیں اسے امریکن کچن نہ سمجھ لیجیے گا۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ وہ ایک بے در و دیوار چھت والا قدرتی ایئر کنڈیشنڈ باورچی خانہ تھا۔ صحن کے مختلف حصوں میں پانی والے ٹب اور بوتلوں والے خالی اور بھرے ہوئے دونوں قسم کے ڈالے بھی رکھے نظر آ رہے تھے۔ اس گھر کا تیسرا کمرا مکان کے سامنے والے حصے میں، داخلی دروازے کے ساتھ بنا ہوا تھا اور اس کمرے میں غلام سرور نے بوتلیں بھرنے والی پریشر مشین لگا رکھی تھی۔ گویا یہ اس کی کولڈ ڈرنک فیکٹری تھی!

غلام سرور نے ہمیں اپنے گھر کے صحن میں بٹھایا۔ اگرچہ موسم کافی گرم تھا لیکن سائے دار درختوں کے نیچے... چارپائی پر بیٹھنا خاصا خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔ غلام سرور اور اس کی بیوی آسیہ ہمارے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھ گئے تو میں نے کہا:

''غلام سرور! مجھے تمہارے کہے ہوئے الفاظ پر تو کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں لیکن میں نے سوچا کہ خود ہی تمہارے گاؤں کا ایک چکر لگا لیتا ہوں۔ اس طرح رفعت اور فریدہ سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور میں جائے وقوعہ کا جائزہ بھی

لے لوں گا۔ ہوسکتا ہے، کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے جس کی مدد سے میں زیبو کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوجاؤں۔''

''آپ نے بہت اچھا کیا جو آگئے۔'' آسیہ بی بی سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ورنہ ہم نے تو پروگرام بنایا تھا کہ صبح ہی صبح آپ کے پاس جائیں گے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''ایسی کیا بات ہوگئی تھی کہ آپ لوگوں کو میرے پاس آنے کا پروگرام بنانا پڑا؟''

''بات دراصل یہ ہے تھانے دار صاحب......'' غلام سرور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''میں نے کچھ رقم آسیہ کے پاس رکھوائی تھی۔ وہ پیسے گھر سے غائب ہیں۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ غلام سرور نے بڑی اہم بات کی تھی۔ آسیہ بی بی نے کہا۔

''ہم اسی وجہ سے آپ کے پاس آنا چاہتے تھے۔''

''کتنی رقم غائب ہوئی ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

''دو ہزار روپے۔'' اس نے جواب دیا۔

''دو ہزار......'' میں نے حیرت بھرے انداز میں دہرایا۔

میری حیرت کا سبب یوں تھا کہ جس زمانے کا واقعہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں تب دو ہزار روپے کوئی معمولی رقم شمار نہیں ہوتی تھی۔ وہ بہت ہی بھلا اور سستا زمانہ تھا۔ ایک عام آدمی کی تنخواہ تیس سے چالیس روپے ہوا کرتی تھی یا زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ روپے۔ سونا ستر، اسی روپے تولہ مل جاتا تھا۔ ایک درمیانے سائز کے گھرانے کا مہینے بھر کا راشن دس روپے میں آجاتا تھا۔ اب آپ خود ہی حساب لگالیں کہ اس دور کے دو ہزار روپے آج کل کتنی مالیت کے حامل تھے!

آسیہ بی بی نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''جی تھانے دار صاحب۔''

غلام سرور نے مجھے بتایا۔ ''میں نے یہ رقم ایک خاص مقصد کے لیے آسیہ کے پاس رکھوائی ہوئی تھی۔ میں ہر ماہ کچھ نہ کچھ پس انداز کرتا رہتا ہوں۔ یہ میری برسوں کی بچت ہے...... بلکہ بچت تھی۔ اب تو وہ گھر سے غائب ہو چکی ہے... آہ!'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر افسردہ انداز میں بتانے لگا۔

''میں بڑی دھوم دھام سے زیبو کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ میں اپنے سامنے والا مکان خرید کر زیبو کو

دینا چاہتا تھا تاکہ شادی کے بعد وہ ہر وقت میری نگاہ کے سامنے رہے۔ میری کوشش تو یہی تھی کہ مجھے کوئی نیک اور صالح گھر داماد مل جائے۔ یہ مکان خرید کر زیبو کو دینے والا منصوبہ اس صورت کے لیے تھا کہ اگر زیبو کا شوہر ہمارے ساتھ رہنے کے لیے راضی نہ ہوا تو میں ان لوگوں کو سامنے والے گھر میں بسا دوں گا مگر...... سب ختم ہو گیا...... زیبو بھی گئی اور...... دو ہزار کی رقم بھی غائب ہے۔"

میں ایک دکھی باپ کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ غلام سرور کے تمام منصوبوں کا ستیاناس ہو گیا تھا۔ میرا ذہن ایک خاص انداز میں سوچ رہا تھا۔ زبیدہ عرف زیبو کی گمشدگی کے ساتھ ہی گھر سے دو ہزار بھی غائب ہوئے تھے لہٰذا ایسا سوچنے میں کوئی قباحت نہیں تھی کہ زیبو وہ رقم اپنی مرضی سے ساتھ لے گئی ہوگی۔ اسی پوائنٹ کو نظر میں رکھتے ہوئے میں نے آسیہ بی بی سے پوچھا۔

"تم نے دو ہزار کی یہ رقم کہاں رکھی تھی؟"

اس نے میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے شوہر کی طرف دیکھا پھر جھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "سرور! تھانے دار صاحب کافی دیر سے بیٹھے ہیں۔ تم ان کے لیے کوئی ٹھنڈی بوتل تو لے کر آؤ۔ دیکھو تو کتنی گرمی ہو رہی ہے۔"

اس نکتے پر میں آسیہ بی بی سے متفق تھا کہ موسم بہت گرم ہو رہا تھا لہٰذا میں نے غلام سرور کو کولڈ ڈرنک لانے سے منع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت میں واقعتاً شدید پیاس محسوس کر رہا تھا اور یقیناً میرے ساتھ آنے والے کانسٹیبل کا بھی یہی حال تھا۔

غلام سرور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "میں ان لوگوں کے لیے دودھ سوڈا بنا کر لاتا ہوں۔"

"دودھ سوڈا" اس زمانے کا ایک معروف اور ہر دل عزیز مشروب تھا جسے گرمی کا توڑ سمجھا جاتا تھا۔ کچے ہوئے دودھ کے اندر سوڈے کی کوئی بھی بوتل ملا کر دودھ سوڈا تیار کر لیا جاتا تھا اور حسبِ ضرورت اس میں چینی اور برف بھی شامل کر لی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لیے عموماً روز اَپ کی بوتل استعمال کی جاتی تھی جس کے اندر موجود سوڈا واٹر کا رنگ سرخ ہوتا تھا۔ دودھ میں شامل ہونے کے بعد اس ٹھنڈے میٹھے مشروب یعنی دودھ سوڈا کا رنگ گلابی ہو جاتا تھا جو گرمی کو منہ توڑ جواب دیتا تھا۔

غلام سرور کے جانے کے بعد میں نے آسیہ بی بی کے سامنے اپنا سوال دہرایا۔ "تم نے دو ہزار کی یہ رقم کہاں رکھی تھی؟"

"کپڑوں والے ٹرنک میں۔" اس نے جواب دیا۔ "تمام کپڑوں کے بالکل نیچے۔"

"اور یہ ٹرنک (بڑا صندوق) کہاں رکھا تھا؟" میں نے استفسارات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرے کمرے میں۔" اس نے گھر کے عقبی حصے میں بنے دو کمروں میں سے ایک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "میں اور سرور (غلام سرور) اسی کمرے میں رہتے ہیں۔"

"کیا زیبو تم لوگوں کے ساتھ اس کمرے میں نہیں رہتی تھی؟"

"نہیں جی...... وہ دوسرے کمرے میں رہتی تھی۔" بات کے اختتام پر اس نے مذکورہ کمرے کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ "گھر میں تمہارے علاوہ یہ بات اور کس کو معلوم تھی کہ دو ہزار روپے کپڑوں والے ٹرنک کی تہ میں رکھے ہوئے ہیں؟"

"یہ بات میرے علاوہ سرور اور زیبو کو بھی پتا تھی۔"

"کیا اس ٹرنک میں تم کوئی تالا وغیرہ بھی ڈال کر رکھتی تھیں؟"

"نہیں جی......" اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ "تالا لگانے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ہم تینوں کے سوا اس گھر میں کوئی آتا جاتا نہیں ہے اور اگر کوئی آتا بھی ہے تو اسے کیا پتا کہ میں نے ٹرنک کے اندر کپڑوں کے نیچے دو ہزار روپے چھپا رکھے ہیں......!"

"گویا یہ رقم تم تینوں میں سے کسی نے غائب کی ہے!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے تیکھے انداز میں سوال کیا۔

"میں کیوں غائب کروں گی جی......" وہ یک لخت پریشان ہو گئی۔ "اور سرور بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ اکثر میرے پاس رقم رکھواتا رہتا ہے اور جب اسے ضرورت ہوتی ہے وہ مجھ ہی سے مانگتا ہے۔"

"اور زیبو کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے......؟" اس کے چہرے پر نگاہ جما کر میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

وہ میرے سوال کو اچھی طرح سمجھ گئی اور بولی۔ "میں زیبو کو بھی چور نہیں سمجھتی تھانے دار صاحب۔"

"تم یہ تو تسلیم کرتی ہو نا کہ گھر سے دو ہزار روپے غائب ہوئے ہیں؟"

"جی...... اس میں تو کوئی شک ہی نہیں۔"

"اور زیبو بھی کل شام سے غائب ہے؟"

"جی۔" اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"کیا اس سے پہلے بھی کبھی گھر میں سے کوئی رقم غائب ہوئی ہے؟"

"نہیں جی ...... کبھی نہیں۔" وہ سر کو انکاری جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "یہ پہلا واقعہ ہے۔"

"اور تم لوگوں نے تھانے میں مجھے بتایا تھا کہ زیبو کی گمشدگی کا بھی یہ پہلا واقعہ ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے وہ کبھی گھر سے غائب نہیں ہوئی تھی؟"

"جی...... جی...... حقیقت یہی ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔

"تم مجھے کیا سمجھتی ہو آسیہ بی بی؟"

میرے اس سوال نے اسے الجھن میں ڈال دیا۔ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"آپ تو تھانے دار ہیں جی۔"

"اور تھانے دار کا کام ہے، تھانے داری کرنا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بات تو تم مانتی ہو نا......؟"

"جی بالکل مانتی ہوں۔" وہ تائیدی انداز میں بولی۔

"میرا پیشہ یعنی یہ "تھانے داری" مجھ سے تقاضا کرتا ہے کہ میں حالات و واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے منطقی انداز میں سوچوں۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اور میں منطقی طور پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ رقم کے غیاب کا زیبو کی گمشدگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ سادہ الفاظ میں تم یہ سمجھ لو کہ جہاں زیبو گئی ہے، رقم بھی وہیں گئی ہے۔"

"میرا تو دماغ کام نہیں کر رہا تھانے دار صاحب۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔

"تم پریشان نہیں ہو آسیہ بی بی۔" میں نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ "تمہیں آزردہ دیکھ کر غلام سرور بھی ہمت ہارنے لگتا ہے۔ تم لوگوں کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب یہ کیس میرے ہاتھ میں ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد میں زیبو کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور پھر رقم کو بازیاب کرنے میں بھی دیر نہیں لگے گی۔"

وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے روہانسے انداز میں بولی۔ "رقم گئی چولہے میں۔ بس زیبو خیریت سے صحیح سلامت واپس آ جائے تو مجھے اور کچھ نہیں چاہیے......"

بات کے اختتام پر اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں میں اترنے والے آنسوؤں کے نمکین سیلِ آب کے آگے بند باندھنے کی کوشش کرنے لگی۔

آسیہ بی بی ایک ماں تھی۔ میں اس کے محسوسات کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ ان لمحات میں بیٹی کی گمشدگی کے حوالے سے بہت زیادہ جذباتی ہو رہی تھی اور ...... اسے مغموم ہونا بھی چاہیے تھا۔ جس کا کلیجا جل رہا ہو وہی اس کی تپش کو محسوس کر سکتا ہے۔ دور سے دیکھنے والے تماشائی کہلاتے ہیں......!

ہمارے بیچ سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا کہ غلام سرور دودھ سوڈے کے ساتھ واپس آ گیا۔ وہ اللہ کا بندہ جگ بھر کر دودھ سوڈا بنا لایا تھا، برف کی آمیزش نے جسے ٹھنڈا ٹھار کر دیا تھا۔ میں نے اور کانسٹیبل نے دو دو کنگ سائز گلاس دودھ سوڈا اپنے معدوں میں اتارا تو گرمی ہم سے کوسوں دور جا کھڑی ہوئی۔ اس "کام" سے فارغ ہونے کے بعد میں نے غلام سرور سے کہا۔

"میں تمہارے دونوں کمروں کو اندر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"جی...... ضرور دیکھیں۔" وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے کانسٹیبل کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور غلام سرور کی معیت میں عقبی کمروں کی سمت بڑھ گیا۔ میرے وہاں سے ہٹتے ہی کانسٹیبل دوبارہ دودھ سوڈے والے جگ کے ساتھ "مصروف" ہو گیا تھا۔

درحقیقت میں غلام سرور کے گھر کا تفصیلی معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ گھر ایک لحاظ سے "جائے وقوعہ" کی حیثیت کا حامل تھا۔ زیبو نے اپنی زندگی کے چوبیس سال اس گھر میں گزارے تھے۔ اس امر کا اغلب امکان تھا کہ اس گھر کے اندر سے مجھے کوئی ایسا سراغ مل جاتا جو زیبو کی بازیافت میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ زیبو کی تلاش کے سلسلے میں مجھے ہر محاذ پر کام کرنا تھا اور اس مشن میں، میں معمولی سے معمولی اشارے کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔

غلام سرور کی راہ نمائی میں پہلے میں نے اس کمرے کا معائنہ کیا جو ان میاں بیوی کے استعمال میں تھا۔ اس کمرے میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ وہاں سے مجھے کوئی بھی ایسی چیز نہیں ملی جو کسی بھی حوالے سے زیبو کی تلاش میں مددگار ثابت ہو سکتی۔ میں مذکورہ کمرے سے نکل کر زیبو والے کمرے میں آ گیا۔

غلام سرور سائے کی طرح میرے ساتھ لگا ہوا تھا جبکہ آسیہ بی بی باہر ہی رہ گئی تھی۔ میں نے زیبو والے کمرے کا

تفصیلی جائزہ لیا تو اس تلاش کے سلسلے میں مجھے پہلی کامیابی حاصل ہوگئی۔ زیبو کے کپڑے والے اٹیچی کیس میں سے مجھے ایک تہ شدہ پرچہ ملا۔ یہ پرچہ کسی لائن دار کاپی میں سے پھاڑ کر الگ کیا گیا تھا۔ میں نے تہ شدہ اس پرچے کو کھول کر دیکھا تو میرے پورے وجود میں سنسنی سی پھیل گئی۔ مذکورہ پرچے پر رقم وہ مختصری تحریر مجھے چونکا دینے کے لیے کافی تھی۔ وہاں لکھا تھا۔

''آج شام چھ بجے میلے میں، سرکس کے قریب...... کھارا۔''

اس یک سطری تحریر سے ظاہر ہوتا تھا کہ کھارا نامی کسی شخص نے شام چھ بجے کسی شخص سے میلے میں سرکس کے قریب ملاقات کی بات کی تھی۔ یہ پرچہ چونکہ زیبو کے اٹیچی کیس میں سے برآمد ہوا تھا لہٰذا ذہن یہی کہتا تھا کہ کھارا نے زیبو سے شام چھ بجے سرکس کے نزدیک میلے میں ملنے کا اشارہ دیا تھا۔ زیبو گزشتہ روز اپنی دو سہیلیوں رفعت اور فریدہ کے ہمراہ میلاد یکھنے گئی تھی۔ حالات و واقعات کی روشنی میں یہ پتا چلتا تھا کہ یہ رقعہ گزشتہ روز صبح یا دوپہر میں کھارا کی جانب سے زیبو تک پہنچا تھا اور پھر زیبو، کھارا سے ملاقات کرنے میلے کی طرف گئی تھی۔

ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ میں نے مذکورہ رقعہ غلام سرور کی جانب بڑھاتے ہوئے استفسار کیا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''جی......'' وہ میرے اس اچانک سوال پر بوکھلا گیا اور اضطراری لہجے میں بولا۔ ''یہ ایک کاغذ ہے جی......''

''تم نے دیکھا، یہ کاغذ مجھے کہاں سے ملا ہے؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''جی تھانے دار صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے اسے زیبو کے اٹیچی کیس میں سے نکالا ہے۔''

میں نے مختصر تحریر والا وہ رقعہ اسے تھماتے ہوئے پوچھا۔ ''دیکھو...... اس میں کیا لکھا ہے؟''

اس نے میرے ہاتھ سے وہ پرچہ لے لیا پھر بے بسی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں چٹا ان پڑھ ہوں جناب۔ میں نہیں جانتا، اس کاغذ پر کیا لکھا ہے۔ آپ پڑھ کر سنا ئیں۔''

مجھے اس کی مجبوری کا احساس ہوگیا۔ میں نے فوراً اس کی فرمائش پوری کردی۔

مذکورہ رقعے کی تحریر سے آشنائی کے بعد غلام سرور کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ ندامت آمیز نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں بولا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھانے دار صاحب...... یہ سب کیا ہے جناب......؟''

''یہ سب زیبو کی گمشدگی کا خلاصہ ہے غلام سرور۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''کسی کھارا نے گزشتہ روز شام چھ بجے تمہاری بیٹی زیبو کو میلے میں سرکس کے نزدیک ملنے کے لیے بلایا تھا۔ مجھے بتاؤ، یہ کھارا کون ہے؟''

''کھارا کا اصل نام افتخار ہے جناب۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''یہ نذیر عرف جیرا ائیلی کا بیٹا ہے۔ جیرا ائیلی اور کھارا ادھر منڈھورا کلاں ہی میں رہتے ہیں لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ کھارا کا میری زیبو سے کیا تعلق......!''

''تعلق تو بہت گہرا ہے غلام سرور۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر واقعی تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تو میں سمجھاتا ہوں......''

میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا۔ غلام سرور وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جارہی تھیں۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ ان پڑھ شخص معاملے کی تہ تک پہنچ چکا تھا تاہم اس کا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ زیبو کا کھارا سے کوئی تعلق واسطہ بھی ہوسکتا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنے تجزیے سے آگاہ کردیا۔

''لیکن ...... یہ کیسے ...... ہوسکتا ہے تھانے دار صاحب......'' وہ نحیف آواز میں بولا۔ ''مجھے بالکل یقین نہیں آرہا......''

''غلام سرور! تمہارے یقین کرنے یا یقین نہ کرنے سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا...... اب یہ سوچو کہ زیبو کو واپس کیسے لانا ہے؟''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ یکا یک زمین پر بیٹھا پھر میرے پاؤں کو تھام کر منت آمیز لہجے میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے......''

مجھے ایک باپ کی بے بسی، بے چارگی اور لجاجت پر بہت ترس آیا۔ والدین بعض حالات میں کس قدر نادم اور مجبور ہوجاتے ہیں۔ غلام سرور کی ذہنی اور قلبی کسمپرسی پر میرا

دل کٹ کر رہ گیا۔ ان لمحات میں میرے دل و دماغ میں صرف ایک ہی آرزو تھی کہ...... کاش! اولاد کے اندر اپنے والدین کی عزت کا احساس جاگ اٹھے......!

میں نے جھک کر غلام سرور کو شانوں سے تھام لیا پھر زور بازو اسے کھڑا کرتے ہوئے حوصلہ بخش لہجے میں کہا۔ ''غلام سرور! زیبو میری بیٹی کی طرح ہے۔ بچوں سے غلطی ہو جاتی ہے۔ وہ نادانی میں غلط قدم اٹھا لیتے ہیں۔ یہ ان کا جذباتی فیصلہ ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر انہیں مطلق احساس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے والدین کے چہروں پر کالک مل کر تاریک راہوں کی مسافرت اختیار کر رہے ہیں۔ انہیں بالکل یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کا یہ اقدام انہیں تباہی و بربادی کے گہرے گڑھے میں جا پھینکے گا۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی بدبختی پر مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں لیکن......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔

''......لیکن بڑوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ چھوٹوں کی کوتاہیوں کو ٹھیک کریں۔ ہم بڑے ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کی اصلاح کرنا ہے۔ تم فکر نہ کرو غلام سرور۔ میں بہت جلد زیبو کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ اس کی تلاش کے سلسلے میں ''کھارا'' کی شکل میں ایک سرا میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔ میں اس ڈور کو تھام کر زیبو اور کھارا تک پہنچ جاؤں گا...... ان شاء اللہ!''

فرطِ ندامت سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ ممنونیت سے لب ریز آواز میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! اگر آپ میری بیٹی کو عزت و آبرو کے ساتھ ڈھونڈ کر صحیح سلامت واپس لے آئیں تو میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

''مجھے انسانوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا آتا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''تم مطمئن ہو جاؤ۔ تمہاری عزت میری عزت ہے۔''

''آپ بہت عظیم ہیں تھانے دار صاحب......!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اللہ میری باقی عمر بھی آپ کو دے دے۔''

''غلام سرور......!'' میں نے اس کے منوں بوجھ تلے دبے ضعف زدہ کندھے کو تسلی بھرے انداز میں تھپتھپاتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''عظیم صرف اللہ کی ذات پاک ہے اور ساری تعریفیں اسی پر جچتی ہیں۔ عزت اور ذلت دینے کا اختیار اسی خالق و مالک کے پاس ہے۔ میں تو اس کا ادنیٰ سا بندہ ہوں اور اپنی بساط بھر کوشش میں لگا رہتا ہوں اور...... کامیابی یا ناکامی اسی پر چھوڑ دیتا ہوں۔ اگر میرے مالک کو منظور ہوا تو زیبو بہت جلد صحیح سلامت تمہارے سامنے ہو گی۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے تھانے دار صاحب۔'' وہ اپنی بھیگی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے بولا۔

اس وقت ہم دونوں کے سوا اس کمرے میں اور کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا اور یہ اچھا ہی تھا ورنہ میں نے اس کیس کو حل کرنے کے لیے زیبو کے اپیچی کیس سے جو اہم سراغ ڈھونڈ نکالا تھا، وہ کسی تفتیش اور تحقیق کے مرحلے سے گزرے بغیر ہی کسی سنسنی خیز انکشاف کے مانند جنگل کی آگ کی طرح منڈھورا کلاں کے قرب و جوار میں پھیل جاتا جس کے نتیجے میں مجھے کارِ سرکار کے حوالے سے مختلف نوع کی دقت اور دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسی خدشے کے پیش نظر میں نے کہا۔

''غلام سرور! یہ راز صرف ہم دونوں کے بیچ رہنا چاہیے کہ کھارا اور زیبو کے حوالے سے مجھے کوئی رقعہ ملا ہے۔ جب تک میں تم سے نہ کہوں، تم مختصر تحریر والے اس پرچے کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟''

''اچھی طرح سمجھ گیا سرکار۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس سلسلے میں، میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ آپ مجھ پر بھروسا کر سکتے ہیں۔''

میں نے اس رقعے کو تہ کر کے اپنی جیب میں رکھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''غلام سرور! میں نے تمہارے ذمے ایک کام لگایا تھا۔ اس سلسلے میں تم نے کچھ کیا؟''

''کون سا کام تھانے دار صاحب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''وہ جو میں نے تم سے کہا تھا کہ میں رفعت اور فریدہ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''کیا تم نے اس کا کوئی بندوبست کیا ہے؟''

''جی۔ میں نے ان دونوں کے گھر والوں سے بات کی ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن ایک مسئلہ ہے......''

وہ متذبذب انداز میں رکا تو میں نے پوچھا۔ ''کون سا مسئلہ؟''

''میں نے رفعت کے باپ وزیر علی اور فریدہ کے باپ حکیم بسم اللہ کو آپ کے بارے میں بتایا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس سلسلے میں حکیم بسم اللہ نے ایک درخواست کی ہے۔''

"کیسی درخواست؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"حکیم بسم اللہ کا کہنا یہ ہے کہ لڑکیوں کو تھانے بلا کر تفتیش کرنا مناسب نہیں۔" غلام سرور نے منت ریز لہجے میں بتایا۔ "یہ عزت دار لوگ ہیں۔ جو بھی سنے گا کہ ان کی بیٹیوں کو تھانے میں بلایا گیا ہے، وہ اپنے ذہن کے مطابق سو باتیں بنائے گا۔ تھانے دار صاحب سمجھ دار آدمی ہیں۔ اگر وہ والدین کی مجبوریوں کا احساس کریں تو پوچھ پرتیت کا یہ سلسلہ حکیم بسم اللہ کے گھر پر رکھا جا سکتا ہے۔"

غلام سرور کی بات میں وزن تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا یہ تجویز حکیم صاحب نے دی ہے؟"

"جی سرکار!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے استفسار کیا۔ "کیا رفعت کا باپ وزیر علی اس تجویز سے متفق ہے؟"

"سولہ آنے متفق ہے جناب۔" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "اور رفعت کا شوہر مشتاق محمد بھی اس تجویز سے پوری طرح مطمئن ہے۔"

پھر غلام سرور نے مجھے بتایا کہ کوٹ کشال سے مشتاق آیا ہوا ہے اور ایک آدھ روز میں وہ رفعت اور دو سالہ بیٹے کو اپنے ساتھ کوٹ کشال لے جائے گا۔ ان کی شادی کو تین سال ہوئے تھے۔ عیدو ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔

گمشدہ زبیدہ عرف زیبو آخری مرتبہ گزشتہ شام رفعت اور فریدہ کے ساتھ اپنی گلی کے کونے تک آئی تھی لہٰذا یہ دونوں اس کی تلاش کے سلسلے میں میری خاصی مدد کر سکتی تھیں اسی لیے میں نے پوچھ کچھ کی غرض سے انہیں تھانے بلانے کی بات کی تھی لیکن حکیم بسم اللہ نے جو تجویز پیش کی تھی وہ ہر لحاظ سے جائز اور معقول نظر آتی تھی چنانچہ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"غلام سرور! مجھے حکیم بسم اللہ کی یہ تجویز نما فرمائش منظور ہے۔ تم رفعت کو حکیم صاحب کے گھر میں بلا لو۔ جب تک میں تمہارے گھر کی چھت کی سیر کر لیتا ہوں۔"

"بہت بہتر سرکار......" وہ جلدی سے بولا۔

بات کے اختتام پر وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے فوراً محسوس کر لیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن کسی خاص وجہ سے رک گیا تھا۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں ہچکچاہٹ کو میں بڑے واضح انداز میں دیکھ سکتا تھا۔

"کیا بات ہے غلام سرور۔" میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔ کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

"وہ سرکار......" وہ لجاجت بھرے انداز میں بولا۔ "میں کھاراوالے معاملے کی وجہ سے ڈر رہا ہوں......"

"کیسا ڈر؟" میں نے دریافت کیا۔

"آپ اسے تفتیش کے لیے تھانے بلائیں گے یا ادھر گاؤں ہی میں پوچھ تاچھ کریں گے؟" جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں اس کے خوف کی تہ میں اتر گیا پھر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں اس حوالے سے ڈرنے یا فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ بھی کروں گا، بہت طریقے سلیقے سے کروں گا۔ میرے کسی عمل سے تمہاری عزت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ سرکار۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں آپ کے ایک ایک احسان کو زندگی بھر بھلا نہیں سکوں گا۔"

"میرے احسانات کی گنتی میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے اندر ہمت پیدا کرنے کی کوشش کرو غلام سرور۔" میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے خلوص بھرے انداز میں کہا۔ "اگر انسان ہمت کا دامن تھام کر رکھے تو زندگی کے مسائل اس کے سامنے قدم جما کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ مشکل وقت کو جرأت مندی ہی سے کاٹا جا سکتا ہے۔ اگر انسان ہمت ہار کر بیٹھ جائے تو پھر مشکل وقت اس کی پشت پر سوار ہو جاتا ہے اور...... اسے قبر میں اتار کر ہی دم لیتا ہے۔"

میری بات اس کی سمجھ میں بیٹھ گئی۔ وہ بڑی سرعت سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "جی سر...... میں آپ کی نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

میں نے غلام سرور کو روانہ کیا اور کانسٹیبل کو اپنے پاس بلا لیا اور کہا۔ "معشوق علی! کیا تم اس سے پہلے بھی مندھورا کلاں آئے ہو؟"

مذکورہ کانسٹیبل کا نام معشوق علی اور اس کے بھائی کا نام عاشق علی تھا۔ اکثر لوگ ان دونوں بھائیوں کے ناموں پر حیرت کا اظہار کرتے تھے اور بعض اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق، اظہار رائے بھی کرتے تھے۔ معشوق پستہ قامت اور عاشق دراز قد تھا۔

"جی ملک صاحب!" معشوق علی نے جواب دیا۔ "میں کئی بار یہاں آ چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

تھوڑی دیر کے لیے حکیم صاحب کے گھر میں مصروف رہوں اس دوران میں تم نے ایک اہم کام کرنا ہے۔''
وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ''حکم کریں ملک صاحب۔''
میں نے اسے جیرا تیلی اور اس کے بیٹے افتخار عرف مارا کے بارے میں خصوصی ہدایات دیں اور غلام سرور کی ت کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

حکیم کا اصل نام احمد شجاع تھا لیکن وہ ''حکیم بسم اللہ'' نام سے منڈھورا کلاں اور گردونواح کے تمام گاؤں میں ور تھا اور اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ وہ بات بات پر ''بسم '' کے الفاظ دہراتا رہتا تھا لہٰذا لوگ اسے حکیم احمد شجاع جائے حکیم بسم اللہ کے نام سے جانتے تھے۔
یہ میری حکیم بسم اللہ سے پہلی ملاقات تھی۔ اس کی عمر ستر تجاوز تھی۔ وہ ایک پستہ قامت اور مائل بہ فربہی بدن کا مالک تھا۔ اس کے بال سلامت تھے مگر ان میں مکمل سفیدی جھلکتی تھی۔ یہی حال اس کی ڈاڑھی کا بھی تھا۔ اس نے ٹوپی بھی سفید ہی لگا رکھی تھی۔ حکیم احمد شجاع نے ''بسم اللہ'' کرار سے میرا استقبال کیا پھر بڑی نرمی سے بولا۔
''ملک صاحب! میں آپ کا شکر گزار ہوں جو آپ میری تجویز مان لی۔''
اس وقت میں حکیم بسم اللہ کی بیٹھک میں بیٹھا تھا اور ان ہم دونوں کے علاوہ غلام سرور بھی موجود تھا۔ میں نے م صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''جناب! آپ کی تجویز جائز اور معقول تھی لہٰذا اسے ماننے کے لیے میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ عزت دار دوسروں کی عزت کا بھی پاس کرتے ہیں۔''
''بسم اللہ...... اللہ بھلا کرے آپ کا۔'' وہ پُرسوچ انداز میں سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''انسان ہی دوسرے انسان کو وہی کچھ دے سکتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے۔ عزت والا دوسروں کی بھی عزت کرتا ہے۔''
چند لحات تک ہمارے درمیان زیبو کی گمشدگی کے حوالے سے بات ہوتی رہی۔ حکیم بسم اللہ بھی زیبو کے غیاب سے دکھی تھا۔ زیبو اس کی بیٹی فریدہ کی گہری سہیلی تھی۔ وہ حکیم بسم اللہ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ فریدہ کے دو بھائی اس سے بڑے تھے جن کی عمریں علی الترتیب ... اور تیس سال تھیں۔ فریدہ کم و بیش اٹھارہ سال کی تھی۔
میں نے غلام سرور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے رفعت کو بلا لیا ہے؟''

''رفعت اپنے خاوند کے ساتھ گھر کے اندرونی حصے میں موجود ہے ملک صاحب۔'' غلام سرور کے بجائے حکیم بسم اللہ نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے، پہلے آپ ان لوگوں کو فارغ کر دیں۔ فریدہ تو اپنے گھر کی بچی ہے۔ اس سے۔ آپ بعد میں پوچھ تاچھ کر لیجیے گا۔''
میں نے حکیم بسم اللہ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، آپ پہلی پارٹی کو میرے پاس بھیج دیں۔''
حکیم بسم اللہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو غلام سرور نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں فوراً سے پیشتر اس کی نگاہ کا مطلب سمجھ گیا اور کہا۔
''غلام سرور! میں تنہائی میں دونوں خواتین سے پوچھ کچھ کرنا چاہتا ہوں لہٰذا تمہیں بھی جانا ہوگا۔''
وہ منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر بیٹھک سے باہر نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے رفعت اور مشتاق محمد میرے سامنے موجود تھے۔ رفعت دلکش سراپا کی مالک ایک خوبصورت عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچیس کے آس پاس لگایا۔ بھرے بھرے بدن نے اس کے حسن کی زرخیزی میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ اس کی بہ نسبت مشتاق محمد ''بس ایویں'' سا ہی تھا ''پہلوئے حور میں لنگور، خدا کی قدرت'' والا محاورہ شاید ایسے ہی جوڑوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ مشتاق محمد، رفعت کے ساتھ اس طرح چپکا ہوا تھا جیسے اسے ڈر ہو کہ اگر ایک لمحے کے لیے بھی اس کی نگاہ چوکی تو کوئی اس کی منکوحہ کو چرا لے جائے گا......!
حسین و دل نشیں بیویوں کے واجبی شکل و صورت کے مالک شوہروں کو اکثر و بیشتر بڑے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس قسم کے کیسز میں شوہر نہ چاہتے ہوئے بھی بہت زیادہ شکی مزاج ہو جاتا ہے۔ اگر بیوی مسکرا کر کسی مرد سے بات کر لے تو اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔
میں نے بہ غور اس بے میل جوڑے کا جائزہ لیا پھر مشتاق محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''ادھر کوٹ کشال میں تمہاری کریانے کی دکان کیسی چل رہی ہے؟''
''جی...... اللہ پاک کا شکر ہے؟'' اس نے کھرے لہجے میں جواب دیا۔
''میں نے پوچھا۔ ''چھوٹے عیدو کا کیا حال ہے؟''
''وہ بھی ٹھیک ہے جی۔''
''اسے ساتھ لائے ہو یا وہ نانی کے گھر میں ہے؟''
''ساتھ لائے ہیں جی۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ اندر

حکیم صاحب کے گھر میں ہے۔''

''میں تمہیں ایک زحمت دینا چاہتا ہوں مشتاق محمد......!''

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور بولا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں تھانے دار صاحب!''

''تم تھوڑی دیر کے لیے میدو کے پاس چلے جاؤ۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تم بچے کا خیال رکھو جب تک میں تمہاری بیوی سے سوال جواب کر لیتا ہوں۔''

''وہ جی...... بچہ اندر خیر خیریت...... سے ہے......''

اس نے رفعت کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''میں ادھر ہی بیٹھنا چاہتا...... ہوں جناب......''

میں مشتاق محمد کے تحفظات یعنی اس کی نفسیاتی مجبوری کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن اس وقت میں بھی اپنے فرض کے تقاضوں کے سامنے مجبور تھا۔ اگر مشتاق محمد میرے سر پر سوار رہتا تو رفعت آزادانہ طور پر میرے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی تھی لہٰذا اس شکی اور متذبذب شخص کو بیٹھک سے باہر نکالنا ضروری تھا۔

''مشتاق محمد!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''تھانے دار تم ہو یا میں؟''

وہ میری بات کی تہ تک نہ پہنچ سکا، پلکیں جھپک کر الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''جناب، ظاہر ہے...... تھانے دار تو آپ ہی ہیں۔ میں تو کریانے کی دکان چلاتا ہوں۔''

''اگر تم تھانے دار نہیں ہو تو پھر مجھے تھانے داری کرنے دو۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے۔ ''تم جا کر باہر بیٹھو۔ میں چند منٹ تمہاری بیوی سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ میری بات اس کی سمجھ میں بیٹھی یا نہیں۔ بہر حال، اس نے کوئی ضد بحث نہیں کی اور چپ چاپ بیٹھک سے باہر چلا گیا۔ میں رفعت کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''رفعت!'' میں نے براہِ راست اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''شادی سے پہلے تم ادھر منڈھورا کلاں ہی میں رہتی تھیں اور شادی کے بعد بھی تم گاہے بگاہے یہاں کا چکر لگاتی رہتی ہو اس لیے مجھے امید ہے کہ تم منڈھورا کلاں کے معاملات کو اچھی طرح سمجھتی ہو گی؟''

''جی......'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''اگرچہ اس گاؤں کے تمام لوگوں سے میرا میل جول نہیں لیکن اکثر کو میں جانتی ہوں۔''

''میں دیگر لوگوں کی بات نہیں کر رہا رفعت۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا اشارہ زبیدہ عرف زیبو کی طرف ہے!''

''زیبو کو تو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''اگر تم زیبو کو اچھی طرح جانتی ہو تو پھر یقیناً تمہیں اس بات کا بھی علم ہو گا کہ آج کل اس کا گاؤں کے کسی لڑکے کے ساتھ چکر چل رہا تھا؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔''

''یہ بات تمہارے علم میں نہیں یا تم کسی مصلحت کے پیش نظر مجھے بتانا نہیں چاہ رہی ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''ہوسکتا ہے، زیبو نے تمہیں اس راز کو فاش کرنے سے منع کر رکھا ہو......!''

''میں قسم کھا کر کہتی ہوں جی......'' وہ بے بسی سے بولی ''میں زیبو کے ایسے کسی معاملے سے واقف نہیں ہوں۔''

''تم کہاں تک پڑھی ہوئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''میں نے تو اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی۔''

''مطلب یہ کہ...... تم اردو کا ایک لفظ نہیں پڑھ سکتی ہو؟''

''بالکل نہیں جی۔'' وہ گردن کو نفی میں جھٹکتے ہوئے بولی۔

پہلے میرے جی میں یہ آئی تھی کہ میں رفعت کو وہ معنی خیز رقعہ دکھاؤں جو مجھے زیبو کے اٹیچی کیس میں سے ملا تھا اور پھر اس سے پوچھوں کہ زیبو اور کھارا کے بیچ کون سی کھچڑی پک رہی تھی۔ اسی غرض سے میں نے اس کی تعلیم کے بارے میں سوال کیا تھا لیکن پھر ایک فوری خیال کے تحت میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور پوچھا۔

''زیبو کے باپ غلام سرور نے مجھے بتایا ہے کہ کل تم اور فریدہ زیبو کے ہمراہ میلا دیکھنے گئی تھیں اور واپسی پر تم لوگوں نے زیبو کو اس کی گلی کے کونے تک چھوڑا تھا بلکہ وہ تم دونوں کے سامنے ہی اپنی گلی میں داخل ہوئی تھی......؟''

''سرور چاچا نے آپ کو بالکل ٹھیک بتایا ہے۔'' رفعت نے جواب دیا۔

''کیا اس کے بعد پھر زیبو سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی؟''

''نہیں جی۔''

''مطلب...... تمہیں بالکل اندازہ نہیں کہ زیبو کہاں گم

ہوگئی ہے؟"

"اگر اس بارے میں مجھے کچھ پتا ہوتا تو میں آپ کو ضرور بتاتی۔" وہ بے چارگی سے بولی۔"میں زیبو کی گمشدگی کے لیے خود بہت پریشان ہوں اور میری آرزو ہے کہ وہ جلد از جلد مل جائے۔"

اس کے الفاظ سے سچائی کی بو آتی تھی۔ میں اپنے پیشہ ورانہ تجربے کی روشنی میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ میرے سوالات کے جواب میں وہ کسی نوعیت کی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہی تھی۔ میں مزید دس منٹ تک گھما پھرا کر اس سے مختلف سوالات کرتا رہا لیکن اس انٹرویو کے نتیجے میں کوئی ایسی بات سامنے نہ آسکی جس کی مدد سے میں زیبو تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھاتا۔

میں نے رفعت کو جانے کی اجازت دے کر فریدہ کو اپنے پاس بلالیا۔

فریدہ سترہ اٹھارہ سال کی ایک تیز طرار لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شرارت آمیز ذہانت ٹپکتی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی کھوجی ایسی جھلک تھی۔ فریدہ کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا تھا جن کے اندر تفتیش، تشکیک، تحقیق اور تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا سی بھی وقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس سانولی سلونی لڑکی کے بدن میں ایک بے چین اور مضطرب روح قید تھی۔

"فریدہ! تم نے کتنی تعلیم حاصل کررکھی ہے؟" میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

"میں پرائمری پاس ہوں تھانے دار صاحب۔" اس نے بڑے فخر سے بتایا۔

فریدہ کا فخر بے جا نہیں تھا۔ اس زمانے میں میٹرک پاس شخص بابو کہلاتا تھا۔ اس تناظر میں کسی لڑکی کا پرائمری پاس ہونا آج کل کا گریجویشن سمجھ لیں۔ فریدہ کے حوالے سے میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی تھی اور وہ یہ کہ ......فریدہ ایک نڈر اور بے باک لڑکی تھی۔ اسے اپنی بات کہنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

"ویری گڈ!" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کہا۔"یہ تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ انسان کو کم از کم اتنا تعلیم یافتہ ضرور ہونا چاہیے کہ لکھنے پڑھنے کے میدان میں اسے کسی کی محتاجی نہ ہو......" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ تم زیبو کی سب سے گہری سہیلی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے دل کی ہر بات تم سے کہتی ہوگی۔ اس کا کوئی بھی معاملہ تم سے پوشیدہ نہیں ہوگا......؟"

"گہری سہیلی والی بات تو ٹھیک ہے جی لیکن میں اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ اپنے دل کی ہر بات مجھے بتاتی ہو......"

"یہ تو تم بڑی عجیب بات کررہی ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔"جب وہ تمہاری سب سے گہری سہیلی تھی تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی خاص باتیں تم سے چھپاتی ہو......!"

میری بات کے جواب میں فریدہ نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے دوسرے زاویے سے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔"تم نے پرائمری تک تعلیم حاصل کررکھی ہے۔ مجھے بتاؤ کہ کیا زیبو بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھی؟"

"وہ باقاعدہ اسکول تو نہیں گئی لیکن میں نے کوشش کرکے اسے گزارے لائق لکھنا پڑھنا سکھادیا تھا۔" فریدہ نے بتایا۔

"مطلب یہ کہ وہ اردو کی تحریر پڑھ اور سمجھ لیتی تھی؟"

"جی!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر چونک کر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔"آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟"

میں نے سردست اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور پوچھا۔"کیا زیبو نے کبھی تم سے کسی کے نام کوئی خط لکھوایا تھا؟"

"کبھی نہیں!" وہ پوری قطعیت سے بولی۔

"یا کسی کا بھیجا ہوا کوئی رقعہ تم سے پڑھوایا ہو؟" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"بالکل بھی نہیں ......" وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔"میں سمجھ رہی ہوں، آپ مجھ سے کوئی اہم بات چھپا رہے ہیں......کوئی ایسی بات جس کا تعلق زیبو کی گمشدگی سے ہے۔"

فریدہ متجسس فطرت کی مالک ایک ذہین لڑکی تھی۔ میری معنی خیز کرید سے اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ میں نے زیبو کی گمشدگی کے حوالے سے کسی خاص راز کو پالیا ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ زیبو کے اس کیس سے ملنے والے رقعے کے بارے میں اسے بتادوں۔ وہ یقیناً اس بارے

میں کچھ نہ کچھ جانتی ہوگی۔ میں نے کہا۔

"تم بالکل ٹھیک سمجھ رہی ہو فریدہ!"

"پھر بتائیں نا، آپ مجھ سے کون سی اہم بات چھپا رہے ہیں؟" وہ پُراشتیاق انداز میں مستفسر ہوئی۔

"بتاؤں گا لیکن پہلے تم مجھ سے وعدہ کرو کہ کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کروگی۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ "جب تک میں زیبو کو تلاش نہیں کرلیتا، تم اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھوگی۔"

"جی۔ میں پکا وعدہ کرتی ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "آپ مجھ پر بھروسا کر سکتے ہیں۔"

"تم پر بھروسا ہے جبھی تو میں نے یہ ذکر چھیڑا ہے۔" میں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "تم بہت دانش منداور تعلیم یافتہ لڑکی ہو۔"

اپنی تعریف ہر کسی کو اچھی لگتی ہے۔ میرے توصیفی کلمات سے وہ خوش ہوگئی۔ میں نے اپنی جیب سے وہ تہ شدہ کاغذ نکال کر فریدہ کی جانب بڑھا دیا جو مجھے گمشدہ زیبو کے اٹیچی کیس میں سے ملا تھا۔

اس نے مذکورہ کاغذ کو کھول کر پڑھا۔ اس دوران میں، میں اس کے چہرے اور آنکھوں میں ابھرنے والے تاثرات کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ اس مختصری تحریر نے فریدہ کو چونکا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والی بے یقینی اور حیرت آمیز الجھن نے مجھے بتا دیا کہ وہ زیبو اور کھارا کے بیچ پائے جانے والے کسی معمولی یا غیر معمولی تعلق سے واقف نہیں تھی۔ اس نے دو، تین مرتبہ اس یک سطری تحریر کو پڑھا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ کیا ہے تھانے دار صاحب......؟"

"یہ ایک رقعہ ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "جو کھارا نے زیبو کو لکھا تھا اور اسے بتایا تھا کہ گزشتہ شام زیبو میلے میں سرکس کے قریب اس سے ملاقات کرے۔"

"یہ تو میں بھی سمجھ رہی ہوں۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی پھر پوچھا۔ "یہ خط آپ کو کہاں سے ملا ہے؟"

"زیبو کے کپڑوں والے اٹیچی کیس کے اندر سے۔"

"اوہ......!" وہ ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئی۔

"تم زیبو کی ایک رازدار سہیلی ہو۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور کھارا بھی منہ زورا کلاں ہی کا وسنیک ہے۔ مجھے بتاؤ، میں اس بات پر کیسے یقین کرلوں کہ زیبو اور کھارا کے "عشق پیچے" سے تم واقف نہیں ہو......؟"

"مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ کھارا کے گھر سے زیبو کا رشتہ آیا تھا۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ "اور سرور چاچا نے اس رشتے سے انکار کردیا تھا۔ باقی آپ نے جس "عشق پیچا" کا ذکر کیا ہے، ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

"قسم کھانے کی ضرورت نہیں بیٹی۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے تمہاری بات کا بھروسا ہے مگر تم خود بتاؤ، اس خط کی مختصری تحریر کیا پیغام دے رہی ہے......؟"

"میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں تھانے دار صاحب۔" وہ گمبھیر انداز میں بولی۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں زیبو کے کسی ایسے چکر کی خبر نہیں رکھتی۔ زیبو نے اس حوالے سے کبھی میرے سامنے کھارا کا ذکر نہیں کیا۔"

"تم نے تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا تھا کہ غلام سرور نے زیبو کے لیے آئے ہوئے کھارا کے رشتے سے انکار کردیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس انکار کا کوئی خاص سبب تھا؟ کیا کھارا میں کوئی خامی تھی؟"

"کھارا میں ایسی کوئی خامی نہیں کہ جس کی مذمت کی جاسکے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں سمجھتی ہوں کہ اس انکار کی وجہ صرف یہ ہے کہ چاچا سرور جیرا تیلی اور اس کے بیٹے کھارا کو کم ذات سمجھتا ہے۔"

"کوئی بھی انسان اپنی ذات کی بنا پر کم تر یا برتر نہیں ہوتا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "انسان کا عمل اور کردار اس کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے کا تعین کرتا ہے۔ ایک نیچ ذات کا شخص بھی اپنے فعل اور اخلاق کی بدولت عظمت کی بلندیوں کو چھوسکتا ہے۔"

"آپ کہتے تو ٹھیک ہی ہیں تھانے دار صاحب۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "پر چاچا سرور کو کون سمجھائے......!"

"اس لم ڈھینگ کو میں چنگی طراں سمجھاؤں گا۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "لیکن پہلے میں زیبو کو بازیاب کرلوں......" پھر میں نے اچانک سوال کیا۔ "میلا دیکھنے جانے والا آئیڈیا زیبو کا تھا؟"

"جی۔ یہ پروگرام اسی نے بنایا تھا۔" وہ جلدی سے بولی۔

''ہوں......'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ زیبو نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تم دونوں کو اپنے ساتھ کرلیا تھا اور واپسی پر بھی وہ تم دونوں کی نظروں کے سامنے ہی اپنی گلی میں داخل ہوئی تھی تاکہ... بہ وقتِ ضرورت تم لوگ گواہی دے سکو کہ وہ میلے سے تم دونوں کے ساتھ واپس آئی تھی اور تم لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اسے گلی میں داخل ہوتے دیکھا تھا......!''

''آپ کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے جی۔'' وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''زیبو بہت ہی گھنی لڑکی ہے تھانے دار صاحب۔ اس نے نہ تو کسی کو کھارا والے معاملے کی ہوا لگنے دی اور نہ ہی ہمیں یہ محسوس ہونے دیا کہ وہ کسی خاص مقصد کے لیے میلا دیکھنے کی ضد کررہی تھی۔ اب میری سمجھ میں آرہا ہے کہ اس نے میلے میں......''

اس نے بولتے بولتے اچانک خاموشی اختیار کی تو میں چونک اٹھا۔ میں نے اضطراری انداز میں سوال کیا۔

''اب تمہاری سمجھ میں کیا آرہا ہے؟''

''زیبو نے میلے میں ایک عجیب حرکت کی تھی......!''

''کیسی حرکت؟'' میں نے زور دے کر پوچھا۔

''ہوا کچھ یوں تھانے دار صاحب......'' وہ پُرخیال انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میلے میں مختلف اشیائے خورونوش کے علاوہ روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کے اسٹال بھی لگے ہوئے تھے۔ ہم ان اسٹالز پر فروخت ہونے والی مختلف اشیا کا جائزہ لے رہے تھے کہ چوڑیوں والے ایک اسٹال پر ہمیں محسوس ہوا کہ زیبو ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ ہم نے یعنی میں نے اور رفعت نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ زیبو کہاں غائب ہوگئی؟ ہم دونوں کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ ہم اس کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑا ہی رہے تھے کہ وہ ہمیں سرکس والے تنبو کی طرف سے آتی دکھائی دی۔ قریب پہنچنے پر ہم.. نے جب اس سے پوچھا کہ وہ کہاں مرگئی تھی تو الٹا اس نے ہم پر چڑھائی کردی۔ اس کا اصرار اس بات پر تھا کہ ہم اسے اکیلا چھوڑ کر آگے بڑھ گئے تھے۔ ہم اس وقت چوڑیوں والے جس اسٹال پر کھڑے تھے، سرکس والے تنبو اس کے عقب میں تھے یعنی ہم لوگ سرکس کو پیچھے چھوڑ کر یہاں پہنچے تھے۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا اور سرزنش بھرے انداز میں کہا۔

''ہم نے تمہیں نہیں چھوڑا بلکہ تم خود ہی ہوشیاری سے پیچھے رہ گئی تھیں۔''

رفعت نے بھی اسے لتاڑا۔ ''تم تو 'الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے' والی بات کررہی ہو......!''

ہمارے انداز سے زیبو گھبرا گئی اور لکنت زدہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ نا...... مجھے ایک اسٹال پر...... ململ کے دوپٹے نظر آئے تو میں انہیں ...... دیکھنے کے لیے رک گئی تھی۔ جب میں نے نگاہ اٹھائی تو تم دونوں مجھے دکھائی نہیں دیں...... میں نے بڑی مشکل سے تمہیں ڈھونڈا ہے۔ دیکھ رہی ہو نا، میلے میں کتنا رش ہے۔''

فریدہ نے مجھے بتایا۔ ''زیبو کی وضاحت میں اگرچہ کوئی دم نہیں تھا لیکن اس وقت چونکہ میرے ذہن میں اس کے حوالے سے شک والی کوئی بات موجود نہیں تھی لہٰذا میں اس کی بات پر اعتبار کرکے مطمئن ہوگئی تھی مگر......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''اب یہی لگ رہا ہے کہ زیبو نے ہم سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر یقیناً کھارا سے ملنے گئی تھی اور انہوں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ زیبو ہمارے ساتھ میلے سے واپس جائے گی اور جب ہم اسے اس کی گلی میں داخل کرکے آگے بڑھ جائیں گے تو وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق دوبارہ کھارا کے پاس پہنچ جائے گی۔ تھانے دار صاحب......'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا شک بالکل درست ہے۔ مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ زیبو اپنی مرضی سے کھارا کے ساتھ کہیں گئی ہے۔''

''فریدہ! تم ایک ذہین اور عقل مند لڑکی ہو۔'' میں نے تعریفی انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''بڑی ہوکر تم کیا بنوگی؟''

''کیا میں آپ کو بڑی نہیں لگتی؟'' فریدہ کے استفسار سے معصومیت جھلکتی تھی۔

''بڑی تو میں تمہیں اس وقت مانوں گا جب تم ان تمام باتوں کو راز رکھوگی جس کی میں نے تمہیں تاکید کی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ویسے میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آگے تمہارا کیا ارادہ ہے۔ تم نے اپنی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''ابا جی تو مجھے حکیمنی بنانا چاہتے ہیں۔'' وہ میری بات کو سمجھتے ہوئے بولی۔ ''جبکہ ریاض اور فیاض میرے دونوں بڑے بھائیوں کی یہ خواہش ہے، جلد از جلد میری شادی

کر دی جائے۔"

"تمہارے ابا جی حکیم بسم اللہ کا ارادہ نیک ہے اور تمہارے دونوں بھائیوں کی سوچ بھی خاصی معقول ہے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "اس حوالے سے تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا جی ......" وہ سادگی سے بولی۔

"تمہاری سمجھ میں کچھ اس لیے نہیں آتا کہ تم اچھی خاصی سمجھ دار ہو۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "جو لوگ عقل سے پیدل ہوتے ہیں وہی سب سمجھنے کے دعوے کرتے ہیں۔ ویسے تمہارے لیے میرا ایک مشورہ ہے......"

وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "کون سا مشورہ جی؟"

"اگر تمہارے ابا جی اجازت دیں تو تم پولیس ڈیپارٹ منٹ میں ملازمت اختیار کرلو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے اندر پولیس والوں کی طرح تجزیہ کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ تم اس شعبے میں بہت کامیابی حاصل کر سکتی ہو۔"

"آپ مذاق تو نہیں کر رہے......؟" وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"اللہ...... آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "مجھے تھانے داری بننے کا بہت شوق ہے مگر ابا جی مجھے حکیمنی بنانا چاہتے ہیں......" پھر وہ خاصی مچل کر بولی۔ "آپ ابا جی سے میرے بارے میں بات کریں نا!"

"میں تمہارے سلسلے میں حکیم بسم اللہ سے بات کروں گا مگر زیبو کی گمشدگی والے اس کیس کو حل کرنے کے بعد۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "اور جب تک میں زیبو کا سراغ نہیں لگا لیتا تم نے کسی کو نہیں بتانا کہ ہمارے بیچ کیا اہم باتیں ہوئی ہیں۔ تم سمجھ رہی ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"بڑی چنگی طراں سمجھ رہی ہوں جی۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

"شاباش!" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی۔ "تھانے دار صاحب! آپ جلد از جلد زیبو کو ڈھونڈ نکالیں۔"

"ان شاء اللہ! میں زیبو کی بازیابی کے لیے پوری کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔

ایک دو مزید سوالات کے بعد ضروری ہدایات دے کر میں نے فریدہ کو فارغ کر دیا۔ میں حکیم بسم اللہ کے گھر سے نکلا تو غلام سرور میرے ہمراہ تھا۔ اس نے فکرمند لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔

"تھانے دار صاحب! میری بیٹی کا کچھ پتا چلا آپ کو؟"

"ہاں۔ ایک سراغ تو ملا ہے......" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"کچھ مجھے بھی تو بتائیں سرکار۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا لہٰذا حتی الامکان نرم لہجے میں، میں نے کہا۔ "اب تک جو حالات و واقعات سامنے آئے ہیں ان کی روشنی میں تو یہی نظر آ رہا ہے کہ زیبو اپنی مرضی سے کھارا کے ساتھ کہیں گئی ہے لیکن اس امر کا حتمی فیصلہ کل شام تک ہوگا۔ اس دوران میں دو اہم کام کرنا ہیں...... ایک تم نے اور ایک میں نے۔"

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے انداز میں کھارا کے بارے میں تفتیش کروں گا اور تم نے اپنے ان تمام عزیزوں اور رشتے داروں سے رابطہ کر کے یا ان کے پاس جا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا ہے کہ زیبو کہیں ان میں سے کسی کے گھر تو نہیں پہنچ گئی......!"

"جی ٹھیک ہے۔ میں کل صبح ہی اس مہم پر روانہ ہو جاؤں گا۔" وہ فرماں برداری سے بولا۔ "لیکن......"

وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے سوال کیا۔ "لیکن کیا غلام سرور؟"

"آپ جو کھارا کے بارے میں منڈھورا کلاں میں پوچھ پرتیت کریں گے اس سے میری عزت کا جنازہ نکل جائے گا تھانے دار صاحب......" وہ نم ناک آواز میں بولا۔

"میری بات غور سے سنو غلام سرور......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ زیبو تمہاری عزت کو خاک میں ملا کر جا چکی ہے۔ اب اس عزت کا جنازہ اٹھے یا تدفین ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں کہ پورے

منڈھورا کلاں میں زیبو اور کھارا کے تعلقات کا ڈھونڈورا پیٹتا پھروں گا۔ تیسری بات یہ کہ مجھے بھی تمہاری عزت کا بہت خیال ہے۔ میں نے کہا نا کہ میں اپنے انداز میں طریقے سلیقے سے کھارا کے بارے میں تفتیش کروں گا۔ منڈھورا کلاں میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ میں کیا کرتا پھر رہا ہوں......''

''آپ کا بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

''اور آخری بات......'' میں نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''تم بھی ان معاملات میں اپنی زبان کو بند ہی رکھنا۔ سمجھ گئے نا؟''

''جی، میں سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم نے زیبو کے لیے آنے والے جن پانچ چھ رشتوں کی بات کی تھی، کیا ان میں افتخار عرف کھارا تیلی کا رشتہ بھی شامل تھا؟''

''جی۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''کیا کھارا اوباش، آوارہ، نکھٹو اور نکما لڑکا ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''نہیں جی۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''پھر اس کے رشتے سے انکار کی وجہ؟''

''وہ جی...... ایک تو وہ ذات کا تیلی ہے۔'' وہ اپنی سوچ کے مطابق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دوسرے اس کا خاندان بہت بڑا ہے۔ کھارا کے چھ بھائی اور پانچ بہنیں ہیں۔ وہ میرے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔''

میرا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ ذات پات کے معاشرتی نظام کے حوالے سے اسے کھری کھری سناؤں لیکن وہ اس وقت جس جذباتی صدمے سے دوچار تھا، اس کا تقاضا یہی تھا کہ فی الحال میں کوئی ایسی سخت بات نہ کروں جس سے اس کی ذہنی اور قلبی اذیت میں اضافہ ہو لہٰذا میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''غلام سرور! تم جس بندے کو گھٹیا ذات اور کم نسل سمجھتے تھے، تمہاری بیٹی نے اسی شخص کا انتخاب کر کے تمہاری آنکھیں کھولنے کا سامان کر دیا ہے۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ اپنی ذاتی انا کی تسکین کے لیے تم آنکھیں بند کیے خواب خرگوش کے مزے لیتے رہو......''

وہ ہکا بکا مجھے تکتا چلا گیا۔ باتیں کرتے ہوئے ہم تانگے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ غلام سرور کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میری تنازع کے جواب میں کیا کہے اور میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ لازمی کوئی جواب دے۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔

''غلام سرور! آرام سے گھر جاؤ اور میں نے تمہیں جو ہدایات دی ہیں، صبح اٹھ کر اس مشن کا آغاز کر دو۔ اللہ خیر کرے گا۔''

''میری زیبو تو مل جائے گی نا......؟'' وہ دکھی لہجے میں مستفسر ہوا۔

''ان شاء اللہ!'' میں نے تہ دل سے کہا۔ ''اللہ کی رحمت اور میری کوشش پر یقین رکھو۔ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

غلام سرور کو تسلی تشفی دینے کے بعد میں تانگے میں بیٹھ گیا۔ کانسٹیبل معشوق علی نے بھی میری تقلید کی پھر میرے اشارے پر کوچوان نے تانگے کو منڈھورا کلاں سے رسول پور تارڑ کی سمت بڑھا دیا۔ جب ہم منڈھورا کلاں کی حدود سے نکلے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح میں نے کانسٹیبل معشوق علی کو موضع کولھو وال روانہ کر دیا۔ گزشتہ شام جب میں حکیم بسم اللہ کی بیٹھک میں رفعت اور فریدہ کا انٹرویو کر رہا تھا تو اس وقت مذکورہ کانسٹیبل منڈھورا کلاں میں گھوم پھر کر میرے حکم کی تعمیل میں مصروف تھا۔ میں نے کھارا کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کا کام معشوق علی کے سپرد کیا تھا اور اس اللہ کے بندے نے بڑے تسلی بھرے انداز میں یہ کام سرانجام دے ڈالا تھا۔

معشوق علی کی تحقیق کے مطابق، زیبو کی گمشدگی سے ایک روز قبل افتخار عرف کھارا موضع کولھو وال چلا گیا تھا۔ اس واقعے کو چونکہ ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے اس لیے مجھے بالکل درست تاریخیں تو یاد نہیں ہیں۔ ہم واقعات کو آسانی سے سمجھنے کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ زیبو بائیس مئی کی شام سے لاپتا تھی اور اس کی گمشدگی کی رپورٹ تیئس مئی کی صبح میرے تھانے میں درج کرائی گئی تھی اور آج چوبیس مئی کی صبح تھی۔ اس حساب سے کھارا اکیس مئی کی صبح منڈھورا کلاں سے کولھو وال روانہ ہوا تھا۔ ان تاریخوں کو حتمی نہ سمجھا جائے۔ بس، یہ بات ذہن نشین رہے کہ وہ مئی کا مہینا

اور گندم کی کٹائی کا موسم تھا۔

کولھو وال نامی گاؤں، منڈھورا کلاں سے لگ بھگ چار میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا دیہات تھا جہاں کھارا کی خالہ رہتی تھی۔ کھارا اپنی خالہ بلقیس فاطمہ سے ملنے کولھو وال گیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ معشوق علی کی فراہم کردہ ان معلومات میں کس حد تک صداقت تھی۔ آیا کھارا اکیلا کولھو وال پہنچا تھا یا زیبو بھی اس کے ساتھ تھی؟ یا وہ لوگ کولھو وال کی طرف گئے ہی نہیں تھے؟ ان تمام سوالات کے جواب اسی وقت مل سکتے تھے جب معشوق علی کولھو وال سے واپسی پر اپنی رپورٹ پیش کرتا۔

معشوق علی کی واپسی کا انتظار کرنا میری مجبوری تھی مگر میری سوچ کی راہ میں کوئی رکاوٹ، وقت یا دشواری حائل نہیں تھی۔ میں تھانے میں بیٹھا مسلسل زیبو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میری اب تک کی محنت سے جو نتیجہ برآمد ہوا تھا اس کے مطابق تو یہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ زیبو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت، اپنی رضامندی سے کھارا کے ساتھ گئی تھی۔ کہاں؟...... اس بات کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔ اغلب امکان یہی دکھائی دے رہا تھا کہ وہ لوگ کولھو وال کی طرف گئے ہوں گے۔ میں نے امکان کی بات کی ہے۔ حتمی نتائج تو معشوق علی کی واپسی پر ہی سامنے آنا تھے۔ عین ممکن تھا کہ میں جیسا سوچ رہا ہوں، سب کچھ اس کے برعکس نکل آئے!

ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن سردست یہ ہوا کہ سہ پہر کے وقت غلام سرور میرے پاس تھانے پہنچ گیا۔ گرمی نے اس کی مت مار رکھی تھی۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ میں نے اسے ٹھنڈے پانی کے دو گلاس پلائے تو اس کے ہوش ٹھکانے آئے۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے بتایا کہ آج صبح سے وہ اپنی سائیکل پر گاؤں گاؤں گھومتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم نے چلچلاتی دھوپ میں کس قدر تکلیف اٹھائی ہوگی۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا اس دوڑ دھوپ کا کوئی مثبت نتیجہ بھی سامنے آیا؟''

اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہوئے اور وہ بڑی غمگین نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ مجھے اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ وہ زیبو کی تلاش کے مشن میں ناکام لوٹا تھا۔ نامرادی اس کے چہرے پر رقم تھی اور ناامیدی بڑے خوفناک انداز میں اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔

''کیا ہوا غلام سرور؟'' میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا، گلوگیر آواز میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! زیبو کہیں بھی نہیں ملی......''

میں نے تسلی دلاسا دے کر اسے قدرے نارمل کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بس تو پھر اس کا ایک ہی مطلب ہے......''

''کیا مطلب ہے سرکار؟'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔

''مطلب یہ کہ وہ کھارا کے ساتھ ہی گئی ہے۔'' میں نے رسان سے جواب دیا۔

''مگر وہ گئی کہاں ہے......؟'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔

''پہلا امکان موضع کولھو وال کا ہے۔'' میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔

''کولھو وال......؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''کولھو وال میں کھارا کی خالہ رہتی ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''کھارا کے بارے میں مجھے پتا چلا ہے کہ وہ وقوعہ سے ایک روز پہلے اپنی خالہ سے ملنے کولھو وال گیا ہے لہٰذا اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے کہ کھارا، زیبو کو اپنے ساتھ کولھو وال لے گیا ہو۔''

غلام سرور میرے اس مشن سے آگاہ نہیں تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے اس بارے میں بتایا۔ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ کولھو وال میں جیرا تیلی کی سالی بلقیس رہتی ہے لیکن مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ کھارا، زیبو کی گمشدگی سے ایک دن پہلے کولھو وال......'' وہ بولتے بولتے رک گیا پھر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''جب کھارا اس واقعے سے ایک دن پہلے ہی کولھو وال چلا گیا تھا تو پھر وہ زیبو کو کہیں کیسے لے کر جا سکتا ہے تھانے دار صاحب؟''

''یہی معلوم کرنے کے لیے میں نے اپنے ایک کانسٹیبل کو آج صبح ہی کولھو وال روانہ کر دیا ہے۔'' میں

نے معتدل انداز میں کہا۔ ''شام تک یہ عقدہ بھی کھل ہی جائے گا۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر کانسٹیبل معشوق علی میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے اور آنکھوں سے ناکامی جھلکتی تھی۔ وہ مضمحل انداز میں میرے سامنے اور غلام سرور کے پہلو میں ایک کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے پوچھا۔

''ہاں بھئی معشوق علی! اس عاشق جوڑے کا کچھ پتا چلا؟''

''بڑی گڑبڑ ہے ملک صاحب۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''کیسی گڑبڑ؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کھارا کی خالہ بلقیس فاطمہ نے بتایا ہے کہ کھارا اکیس مئی کی دوپہر میں اس کے گھر آیا تھا۔'' کانسٹیبل اپنی کارروائی کی روداد بیان کرتے ہوئے بولا۔ ''اور پھر اگلی صبح یعنی بائیس مئی کو وہ واپس منڈھورا کلاں چلا گیا تھا۔ اس کے بعد ان لوگوں کو کھارا کی کوئی خیر خبر نہیں۔''

زیبو بائیس مئی کی شام میلے سے واپسی پر غائب ہوئی تھی اور زیبو کے اٹیچی کیس سے ملنے والا رقعہ بتاتا تھا کہ اسی تاریخ کو وہ پرچہ زیبو تک پہنچا تھا ورنہ اس پر ''آج شام'' کے الفاظ درج نہ ہوتے۔ اگر کھارا بائیس مئی کی صبح کولھووال سے منڈھورا کلاں کے لیے روانہ ہوا تھا تو اس کا یہ مطلب تھا کہ اس نے یہ پیغامی رقعہ وقوعہ کے روز دوپہر میں زیبو تک پہنچایا تھا۔

''کھارا تو خاصا چالباز قسم کا بندہ معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''منڈھورا کلاں میں اس نے یہ تاثر دیا کہ وہ وقوعہ سے ایک روز پہلے ہی کولھووال چلا گیا تھا تاکہ زیبو کی گمشدگی کے حوالے سے کسی کا اس کی طرف دھیان نہ جائے۔ اس کے بعد وہ نہایت ہی خاموشی سے منڈھورا کلاں آیا اور زیبو کو میلے میں سرکس کے قریب شام چھ بجے پہنچنے کی ہدایت کی۔ زیبو نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور میلے سے واپسی پر وہ غائب ہوگئی یعنی اپنے عاشق کے ساتھ کسی نئی منزل کی جانب روانہ ہوگئی۔ منڈھورا کلاں والوں کے ریکارڈ میں کھارا اپنی خالہ کے گھر کولھووال گیا ہوا ہے۔ بلقیس فاطمہ کے ریکارڈ کے مطابق، اس کا بھانجا کھارا ایک دن اس کے پاس گزار کر واپس منڈھورا کلاں چلا گیا ہے اور ہم یہاں بیٹھے اپنے ریکارڈ کو درست کرتے ہوئے یہ سوچ رہے ہیں کہ زیبو اور کھارا سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو چکے ہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ان دونوں کا منصوبہ خاصا جاندار ہے لیکن میں اتنی آسانی سے ان کی جان نہیں چھوڑوں گا۔ وہ اگر پاتال میں بھی چھپے بیٹھے ہوں گے تو میں انہیں گردن سے پکڑ کر باہر کھینچ لاؤں گا۔''

''تھانے دار صاحب! مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا کہ زیبو اتنا بڑا قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔'' غلام سرور نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

''تمہارے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''زیبو منظر سے غائب ہے۔ حالات و واقعات یہ بتاتے ہیں کہ وہ اپنی رضا سے کھارا کے ساتھ کہیں گئی ہے۔ اس حقیقت کو بدلا نہیں جاسکتا۔''

''ملک صاحب! میرا خیال ہے کہ کھارا کے گھر والوں کو بھی شاملِ تفتیش کرنا چاہیے۔'' معشوق علی نے صلاح دینے والے انداز میں کہا۔ ''ہوسکتا ہے، ہم کسی اہم سراغ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔''

''تم زیادہ تھکے ہوئے تو نہیں ہو؟'' میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

''آپ حکم کریں ملک صاحب!'' وہ کراری آواز میں بولا۔ ''اگر میں تھکا ہوا بھی ہوں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''میں تمہاری تجویز سے عملی اتفاق کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' میں نے پُرمعنی انداز میں کہا۔ ''اور اس کے لیے تمہارا چاق و چوبند ہونا ضروری ہے۔''

''میں ایک دم فٹ ہوں جناب۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

''تم ابھی اور اسی وقت غلام سرور کے ساتھ منڈھورا کلاں روانہ ہوجاؤ۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں کھارا کے باپ جیرا تیلی یا اس کے کسی بھائی کو تھانے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ملک صاحب!'' وہ یک لخت اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بڑے اعتماد سے بولا۔ ''آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے میں بالکل تیار ہوں۔''

میں نے غلام سرور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی معشوق علی کے ساتھ جاؤ اور اپنے گھر میں آرام سے بیٹھو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ زیبو کو تلاش کرنا میری ذمے داری ہے۔ میں نے تمہاری خواہش پر

زیبو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کررکھی ہے۔اب میں کھارا کے خلاف اغوا کا مقدمہ درج کرنے والا ہوں۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ زیبو کو بازیاب کرنا میرے فرائض کا حصہ ہے۔''

وہ مطمئن ہوکر معشوق علی کے ساتھ رخصت ہوگیا۔

میں نے اے ایس آئی نیک محمد کو اپنے پاس بلالیا۔ نیک محمد زیبو کی گمشدگی کی تفصیلات سے پوری طرح آگاہ تھا۔میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا صبح پانچ چھ اہلکار میسر ہوسکتے ہیں؟''

''جی ملک صاحب۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔''آپ کے ذہن میں کیا پلان ہے؟''

''میں دو دو پولیس اہلکاروں پر مشتمل تین چھاپا مار ٹیمیں تشکیل دینا چاہتا ہوں۔'' میں نے اے ایس آئی کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔''یہ ٹیمیں علی الصباح تھانے سے روانہ ہو جائیں گی اور اریب قریب کے تمام گاؤں دیہات میں زیبو اور کھارا کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گی۔تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟''

''بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب۔'' وہ توانا لہجے میں بولا۔''میں خود اپنی نگرانی میں آج رات ہی تین ٹیمیں تیار کر کے انہیں سب سمجھا دوں گا۔ بلکہ ایک ٹیم میں، میں خود بھی شامل ہوں گا۔ ہم سب سادہ لباس میں کل تڑکے تڑکے تھانے سے روانہ ہو جائیں گے۔''

''شاباش!'' میں نے اس کے منصوبے کو سراہتے ہوئے ستائشی انداز میں کہا۔''امید ہے، کل شام سے پہلے تم مجھے کوئی خوش خبری سناؤ گے!''

''ان شاء اللہ!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔''میرا ارادہ تو یہی ہے۔ میں آپ کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔''

تھوڑی دیر تک ہم زیبو کی گمشدگی کے حوالے سے باہمی اظہار کرتے رہے پھر اے ایس آئی کسی کام سے اٹھ گیا۔ میں عموماً اس وقت تک اپنے کوارٹر میں چلا جاتا تھا لیکن آج میں جم کر تھانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے کانسٹیبل معشوق علی کی واپسی کا انتظار تھا۔ ویسے بھی میرا کوارٹر تھانے کے عقبی حصے میں بنا ہوا تھا۔

لگ بھگ ساڑھے نو بجے معشوق علی منڈھورا کلاں سے واپس آ گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ نذیر عرف جیرا تیلی بھی اس کے ساتھ تھا۔ جیرا خاصا برہم نظر آتا تھا۔ جب وہ میرے سامنے حاضر ہوا تو اکھڑے ہوئے لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

''تھانے دار صاحب! آپ نے کس قانون کے تحت اس وقت مجھے تھانے بلایا ہے؟''

''تھانے بلانے کے لیے کسی ٹائم ٹیبل پر مبنی کوئی قانون ابھی تک بنایا نہیں گیا۔'' میں نے قدرے سخت انداز میں کہا۔''میں کسی بھی شخص کو کسی بھی وقت تھانے بلانے کا مجاز ہوں۔''

''پر میرا قصور کیا ہے جناب؟'' میرے جارحانہ تیور دیکھ کر وہ فوراً نرم پڑ گیا۔''ہم پہلے ہی پریشان بیٹھے تھے، اوپر سے آپ کا سپاہی مجھے پکڑ کر تھانے لے آیا ہے۔یہ کوئی انصاف تو نہ ہوا نا......!''

''انصاف ہمیشہ کسی معاملے کے آخری مرحلے پر کیا جاتا ہے جیرا۔ ابھی تو شروعات ہے۔'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔''تمہارے قصور پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم اپنے گھر میں کیوں پریشان بیٹھے تھے اور......اس بات کی تسلی رکھو میں انصاف کے تقاضے پورے کرنے میں ذرا سی بھی کوتاہی نہیں کروں گا۔''

''وہ جی......ہمارے گھر میں......چوری ہوگئی ہے......'' اس نے بتایا۔

''اوہ......!'' میں نے افسوس بھرے انداز میں ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔''یہ کب کا واقعہ ہے؟''

''صحیح وقت کا تو پتا نہیں جناب۔ ہمیں آج صبح ہی پتا چلا ہے۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔''کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ یہ کس قسم کا چور تھا جس نے......''

وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔''جس نے کیا......؟''

''جس نے صرف طلائی زیور چرایا ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔''باقی گھر کی ہر شے جوں کی توں اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہے،صرف زیورات غائب ہوئے ہیں۔''

میرا ذہن تیز رفتاری سے ایک خاص انداز میں سوچنے لگا۔ میں نے جیرا تیلی سے سوال کیا۔''چوری ہونے والے زیورات کی مالیت کتنی ہوگی؟''

جیرا کی بات سن کر میرے کان کھڑے ہوگئے تھے۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''جناب! ان زیورات کا وزن پندرہ تولے سے زیادہ ہی تھا۔ میرے خیال میں لگ بھگ ڈیڑھ ہزار روپے

کے تو ہوں گے ہی۔ ان میں کچھ زیور تو میری گھر والی کا تھا، باقی میں نے بیٹی کی شادی کے لیے تیار کروایا تھا۔ سب کا سب چلا گیا تھانے دار صاحب......!'' بات کے اختتام پر وہ افسوسناک انداز میں سر کو جھٹکنے لگا۔

''جیرا! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''سمجھ لو کہ میں نے تمہارے گھر سے زیورات چرانے والے چور کو پکڑ لیا ہے۔''

''جی......!'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے اس نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''چور کہاں ہے جی؟''

''وہ تھوڑی سیر و تفریح کے لیے نکلا ہوا ہے۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم فکر نہیں کرو۔ کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے وہ چور میرے تھانے کی حوالات میں بند ہوگا مع مالِ مسروقہ و مغوی زیبو......!''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب......؟''

''جیرا......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جب کوئی چور باہر سے گھر کے اندر داخل ہو کر چوری کرتا ہے تو وہ نقدی، زیورات اور گھر میں موجود ہر قیمتی چیز کو اٹھا لے جاتا ہے لیکن......'' میں نے سانس ہموار کرنے کی غرض سے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن جب گھر کے اندر بسنے والے کسی شخص کو چوری کا خیال آتا ہے تو وہ صرف اپنی ضرورت کی شے ہی چرا کر لے جاتا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں...... گھر کو آگ لگ گئی، گھر کے چراغ سے!''

''آپ بڑی الجھی ہوئی باتیں کر رہے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ پریشان کن انداز میں بولا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ہمارے گھر کے ہی کسی فرد نے زیورات چرائے ہیں؟''

''تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو جیرا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے بیٹے کھارا کا کارنامہ ہے۔ وہ گھر سے زیورات اور گاؤں سے غلام سرور کی بیٹی زیبو کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ میں نے اسی سلسلے میں تمہیں تھانے بلایا ہے۔''

''لیکن جناب! زیبو تو بعد میں گم ہوئی ہے۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ ''کھارا تو ایک دن پہلے اپنی خالہ سے ملنے کولھووال چلا گیا تھا......''

''کیا کھارا کولھووال سے واپس آ گیا ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔

''نہیں جی، وہ ابھی تک ادھر ہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم اگر ایسا سوچ رہے ہو تو احمقوں کی جنت میں رہتے ہو۔'' میں نے جیرا تیلی کے دماغ کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''کھارا اکیس مئی کی صبح منڈھورا کلاں سے نکلا اور اسی روز دوپہر سے پہلے وہ بلقیس فاطمہ یعنی تمہاری سالی کے گھر کولھووال پہنچ گیا۔ اگلی صبح یعنی بائیس مئی کو وہ بلقیس کے گھر سے یہ کہہ کر نکلا کہ واپس منڈھورا کلاں جا رہا ہے۔ وہ منڈھورا کلاں آیا ضرور مگر کسی سے ملا نہیں۔ اس نے زیبو کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ میلے میں آ کر سرکس کے قریب اس سے ملاقات کرے۔ زیبو نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اپنی دو سہیلیوں رفعت اور فریدہ کے ساتھ میلے میں پہنچ گئی۔ اس طرح کھارا کا کام آسان ہو گیا اور وہ زیبو کو لے اڑا۔ میں نے کھارا کے خلاف زیبو کے اغوا کی رپورٹ درج کر لی ہے اور پورے علاقے میں تمہارے ہونہار بیٹے کی تلاش جاری ہے۔ کھارا بہت جلد آہنی سلاخوں کے پیچھے ہوگا۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے رو دینے والے انداز میں بولا۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ کھارا نے ایسا کیا ہوگا۔''

''میں یہ تمام باتیں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں جیرا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میرے پاس ایک ایک چیز کا ثبوت موجود ہے۔ میں نے جس کانسٹیبل کو بھیج کر ابھی تمہیں تھانے بلایا ہے نا یہ صبح کولھووال کا دورہ کر کے آیا ہے اور اس نے تمہاری سالی بلقیس فاطمہ سے ملاقات بھی کی تھی۔ یہ ساری معلومات وہیں سے حاصل ہوئی ہیں اور یہ دیکھو......'' میں نے اپنی میز کی دراز کھول کر وہ تہ شدہ پرچہ نکال لیا جو مجھے زیبو کے اٹیچی کیس سے ملا تھا۔ میں نے مذکورہ رقعہ جیرا تیلی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ تحریری ثبوت بھی دیکھ لو اپنے سپوت کے کرتوت کا......!''

وہ لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ رقعے کی مختصر سی یک سطری تحریر نے اس کے چودہ طبق گل کر دیے۔ وہ بڑی بے بسی

سے بولا۔ ''او کھارا...... یہ تو نے کیا کر دیا......!''

''کھارا نے تو جو کیا، سو کیا۔ اب میں اس کے ساتھ جو کروں گا اس سے کھارا کی آنے والی سات نسلیں بھی سبق حاصل کریں گی۔''

''سرکار! معاف کر دیں۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ ''کھارا نادان ہے۔ اس سے کوتاہی ہوگئی۔ آپ میرے بچے کو بچالیں۔''

''تمہارا بچہ کوئی سولی نہیں چڑھا ہوا جو میں اسے بچالوں۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ایسی نادانیوں اور کوتاہیوں کے لیے قانون کی کتابوں میں مختلف تعزیریں درج ہیں۔ تمہارے اس ننھے منے معصوم بالک کو بھی تمام مراحل سے گزرنا ہوگا۔ قانون امیر غریب، شاہ وگدا سب کے لیے یکساں ہے۔ کوئی اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔''

وہ کرسی سے اٹھا اور میز کے نیچے گھس کر میرے قدموں سے لپٹ گیا پھر رو رو کر اپنے بیٹے کے لیے رحم کی اپیلیں کرنے لگا۔

میں نے بہ مشکل اس سے اپنے پاؤں چھڑائے اور معشوق علی کو حکم دیا۔ ''اس پاگل کے بچے کو باہر نکالو......''

معشوق علی نے کوشش کر کے جیرا تیلی کو کھینچ تان کر میری میز کے نیچے سے نکالا اور دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ ابھی تک معافی کے انداز میں جڑے ہوئے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''جیرا! تم نے کولھو تو لگا رکھا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی سرکار۔'' وہ عاجزی سے بولا۔ ''تیلی، تیل نہیں نکالے گا تو کھائے گا کہاں سے......!''

''تمہارے کولھو کے بیل جب مستی کرتے ہیں تو پھر تم کیا کرتے ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں نے کولھو پر ایک لمبی سے ڈانگ (لاٹھی) رکھی ہوئی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''خر مستی کرنے والے بیلوں کی ٹانگوں پر جب دو چار ڈانگیں پڑتی ہیں تو وہ الف کی طرح سیدھے ہوجاتے ہیں۔''

''ڈانگ'' دراصل نہ تو لاٹھی ہوتی ہے اور نہ ہی چھڑی۔ آپ ڈانگ کو ان دونوں کے اریب قریب کی کوئی چیز سمجھ لیں۔ میں نے جیرا تیلی کی بات کے جواب میں کہا۔

''قانون بھی ایک کولھو ہی کی طرح ہوتا ہے۔ یہ مستی کرنے والے انسان نما بیلوں پر دفعات کی ڈانگیں برساتا ہے۔ پھر جیل کی بلند و بالا سنگلاخ دیواروں کے پیچھے پہنچ کر یہ بیل جیسے اڑیل اور منہ زور انسان الف کی طرح سیدھے ہوجاتے ہیں۔''

اس نے اچانک ایک عجیب حرکت کی۔ اس کے دونوں ہاتھ برق رفتاری سے حرکت میں آئے پھر اس نے اپنی پگڑی اتار کر میرے بوٹوں پر رکھ دی۔ اس کے بعد وہ منت ریز لہجے میں بولا۔

''رحم سرکار...... میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

لعنت ہے ایسی اولاد پر اور غرق ہوں ان کی جوانیاں جن کے کالے کرتوتوں کی وجہ سے ان کے والدین کی عزت خاک میں مل جائے اور انہیں ایسی نامعقول اولاد کے لیے دردر کی ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ ہر کس و ناکس کے قدموں پر سر رکھ کر ان کے لیے رحم کی بھیک مانگنا پڑے......!

میں نے معشوق علی کی معاونت سے بہ مشکل جیرا تیلی کو نارمل کیا۔ جب وہ اپنے حواسوں میں آ گیا تو میں نے اس سے پوچھا۔

''اب دس سے زیادہ کا وقت ہوگیا ہے۔ تم واپس منڈھورا کلاں جاؤ گے یا ادھر تھانے ہی میں تمہارے لیے منجی بسترے کا بندوبست کرادوں؟''

''تھانے میں......؟'' اس نے سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ڈرو نہیں۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''میں تمہیں حوالات میں بند نہیں کر رہا۔ ادھر تھانے کے صحن میں تمہارے سونے کا انتظام کرادوں گا۔''

''نہیں سرکار۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ادھر رسول پور تارڑ میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ میں اس کے گھر میں رات گزار کر صبح آپ کے پاس آ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے کہا۔

جیرا تیلی کے جانے کے بعد میں بھی اپنے کوارٹر میں آ گیا۔

اگلے روز یعنی پچیس مئی کی صبح تین چھاپا مار ٹیمیں تھانے سے روانہ ہوگئیں۔ ان میں ایک ٹیم میں اے ایس آئی نیک محمد بھی شامل تھا۔ یہ تمام پولیس اہلکار سادہ لباس میں تھے اور انہوں نے گردونواح کے تمام گاؤں دیہات کی خاک چھان کر کھارا اور زیبو کو تلاش کرنا تھا۔ نیک محمد نے مجھے بتایا تھا کہ وہ موضع کولھووال کی طرف جا رہا ہے۔ نیک محمد بہت ہی ہوشیار اور زیرک پولیس اہلکار تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ضرور کوئی اہم خبر کے ساتھ لوٹے گا۔

دس بجے کے قریب جیرا تیلی بھی تھانے پہنچ گیا۔ اس

کی ذہنی حالت کافی حد تک سنبھل چکی تھی تاہم وہ ابھی تک سہما ہوا اور پریشان سا تھا۔ سہ پہر کے وقت اے ایس آئی نیک محمد واپس آ گیا۔ وہ میری توقع کے عین مطابق، خاصی مفید معلومات کے ساتھ لوٹا تھا۔ نیک محمد کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک شخص کو دیکھتے ہی جیرا تیلی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ مذکورہ بندہ جیرا کا کوئی شناسا تھا۔

نیک محمد نے مجھ سے کہا ''ملک صاحب! یہ جیرا کا ساڑھو یعنی بلقیس فاطمہ کا خاوند شوکت علی ہے۔'' اس کا اشارہ اس بندے کی طرف تھا جس کو دیکھ کر جیرا کی آنکھوں میں شناسائی کے تاثرات ابھرے تھے۔ ''کھارا اپنے اسی خالو کے گھر ایک دن گزار کر بائیس مئی کی صبح کولھو وال سے واپس منڈھورا کلاں چلا گیا تھا۔''

''اس میں تو کوئی خاص بات نہیں نیک محمد۔'' میں نے سرتاپا شوکت علی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ معلومات تو مجھے پہلے سے حاصل ہیں۔''

''خاص بات اس بندے میں ہے ملک صاحب؟'' نیک محمد نے اپنے ساتھ آئے ہوئے دوسرے شخص کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''شوکت علی کو تو میں محض اس لیے اپنے ساتھ لے آیا ہوں کہ یہ اپنے ساڑھو جیرا کو بتا سکے کہ اس کا سپوت بائیس مئی کی صبح اپنی خالہ کو ''اللہ حافظ'' کہہ کر ان کے گھر سے نکل گیا تھا۔''

''اور اس بندے کی کیا خاصیت ہے؟'' میں نے دوسرے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے اے ایس آئی نیک محمد سے سوال کیا۔

''اس کا نام انور زرگر ہے۔'' نیک محمد نے جواب دیا۔ ''انور کا تعلق موضع کولھو وال سے ہے۔ وہاں اس کی صرافے کی دکان ہے۔ انور زرگر کو اپنے ساتھ لانے کا مقصد یہ ہے کہ اکیس مئی کی سہ پہر کھارا اس کے پاس گیا تھا......''

''پندرہ تولے سونے کے زیورات بیچنے۔'' میں نیک محمد کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''نیک محمد! تم یہی بتانا چاہ رہے ہونا......؟''

جیرا تیلی کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا کہ ان کے گھر سے کم و بیش پندرہ تولے وزن کے طلائی زیورات چوری ہو گئے تھے اور میں نے شک نہیں بلکہ یقین ظاہر کیا تھا کہ یہ اوچھی حرکت کھارا کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس تناظر میں جب نیک محمد نے انور زرگر کا تعارف کرایا اور یہ بتایا کہ کھارا اس سے جا کر ملا تھا تو بے ساختہ پندرہ تولے سونے کی فروخت والا سوال میرے منہ سے نکل گیا تھا۔

نیک محمد نے معنی خیز انداز میں زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا اندازہ درست ہے ملک صاحب۔''

پھر جب میں نے انور سنار سے سوال و جواب کیے تو میرے دوسرے کئی اندازے بھی درستی کی منازل طے کرتے دکھائی دیے۔ انور زرگر نے بتایا کہ اکیس مئی کی سہ پہر کھارا چند طلائی زیورات فروخت کرنے اس کے پاس پہنچا تھا۔ اس نے مذکورہ زیورات کی اچھی طرح جانچ کرنے کے بعد ان کا وزن کیا تو وہ کم و بیش ساڑھے پندرہ تولے نکلا۔ انور نے وہ زیورات اپنے پاس رکھ لیے اور اگلی صبح ادائیگی کا وعدہ کیا۔ ان کے بیچ ایک ہزار روپے کے عوض یہ سودا طے پا گیا تھا۔ آئندہ صبح یعنی بائیس مئی کو کھارا اپنی خالہ اور خالو کے گھر سے رخصت ہو کر سیدھا انور زرگر کے پاس پہنچا۔ انور نے وعدے کے مطابق، گن کر ایک ہزار روپے کی رقم کھارا کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد کھارا کہاں گیا، انور کو کوئی خبر نہیں تھی۔

مگر مجھے یہ خبر تھی کہ کھارا ایک ہزار روپے کی تگڑی رقم کے ساتھ سیدھا منڈھورا کلاں پہنچا تھا۔ اس نے بائیس مئی کی شام چھ بجے زیبو کو میلے میں سرکس کے قریب آنے کو کہا۔ زیبو اپنے گھر سے دو ہزار روپے چرا لائی تھی۔ ان دونوں چوروں نے اپنے اپنے گھر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی اور ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کے پاس تین ہزار روپے موجود تھے۔ اگر جیرا کوئی کام دھندا نہیں بھی کرتا تو اس رقم کے سہارے وہ دو تین سال تک بہ آسانی گزارہ کر سکتے تھے۔

کھارا اور زیبو اپنے اپنے گھر والوں اور منڈھورا کلاں کے باسیوں کی آنکھوں میں یقیناً دھول جھونک کر منظر سے غائب ہو گئے تھے لیکن قانون کی آنکھیں ابھی محفوظ تھیں اور یہ آنکھیں آسمان کے اس پار اور پاتال کی تہ کے نیچے دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ مجھ پر ایک ضد سی سوار ہو گئی کہ آئندہ چوبیس گھنٹے کے اندر میں ہر قیمت پر زیبو اور کھارا کو بازیاب کر کے رہوں گا۔

میں نے شام سے پہلے جیرا تیلی، اس کے ساڑھو شوکت علی اور انور زرگر کو رخصت کر دیا اور آئندہ کے لائحہ عمل کو ترتیب دینے لگا۔

مجھ پر جو ضد سوار ہوئی تھی وہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اگر کوئی بات معمولی ہو تو پھر وہ بھلا ضد کیسے ہو سکتی ہے......! ضد تو نام ہی غیر معمولی تمنا، انتہا پسند سوچ اور ناممکن عمل کا ہے۔

☆☆☆

چھبیس مئی کی صبح بڑی سنسنی خیز اور ہنگامہ پرور تھی!

رات سونے سے پہلے میں نے زیبو اور کھارا کی بازیابی کے لیے ایک جامع منصوبہ ترتیب دے لیا تھا۔ بس، اس پر عملدرآمد کی ضرورت باقی تھی لیکن اگلی صبح "نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے" کے مصداق مجھے اپنے اس منصوبے پر پیش قدمی کی ضرورت ہی پیش نہ آئی اور جن دو "کوبروز" کی مجھے تلاش تھی ان کے حوالے سے ایک حتمی اطلاع تھانے پہنچ گئی۔ اپنی ضد پر عمل کرنے سے پہلے ہی اللہ نے میری عزت رکھ لی تھی۔

وہ اطلاع انتہائی افسوسناک اور صدمے سے بھرپور تھی۔ میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو وہاں میری آمد سے پہلے ہی غلام سرور، جیرا تیلی اور منڈھورا کلاں کے چند وسنیک موجود تھے۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی غلام سرور کے ہاتھوں سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔

"تھانے دار صاحب!" وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ "آپ نے تو مجھے تسلی دی تھی کہ میری بیٹی صحیح سلامت واپس آجائے گی۔ میں دعا کروں۔ میں نے بہت دعائیں مانگیں لیکن دیکھ لیں، موت دعا سے بھی زیادہ طاقتور نکلی......"

"آپ چاہے میرے بیٹے کو کڑی سے کڑی سزا دیں لیکن اسے زندہ کر دیں سرکار۔" جیرا تیلی دونوں ہاتھ جوڑ کر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بولا۔ "آپ کھارا کو زندگی بھر کے لیے جیل میں ڈال دیں، میں اف تک نہیں کروں گا......"

چشم زدن میں یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ زیبو اور کھارا اب زندہ انسانوں کی دنیا میں باقی نہیں تھے۔ دونوں بدنصیب باپوں کی جذباتی کیفیت کو میں بہ خوبی محسوس کر سکتا تھا لہٰذا میں نے کسی بحث و تکرار کی ضرورت محسوس نہ کی اور تسلی تشفی دے کر ان سے حقیقتِ حال جاننے کی کوشش میں لگ گیا۔ جیرا تیلی، غلام سرور اور ان کے ساتھ آنے والے افراد نے جو تفصیلات مجھے بتائیں، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

جیسا کہ یہ بات آپ کے ذہن میں ہے کہ ان دنوں گندم کی کٹائی چل رہی تھی۔ ارشاد اور طفیل نامی دو افراد حسب معمول اپنی درانتیوں کے ساتھ آج صبح فصل کی کٹائی کے لیے کھیتوں میں پہنچے۔ یہ کھیت نہر کے کنارے کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ارشاد اور طفیل نے اپنے کام کا آغاز اسی جگہ سے کیا جہاں پچھلے روز انہوں نے چھوڑا تھا۔ وہ گندم کو اپنی درانتیوں سے کاٹتے ہوئے مخصوص رفتار سے کھیت کے اندر ہی اندر آگے بڑھ رہے تھے کہ کھڑی فصل کے اندر بے سدھ پڑے دو انسانوں کو دیکھ کر وہ چونک اٹھے۔ انہیں فوراً اندازہ ہو گیا، وہ دونوں زندگی کی نعمت سے محروم ہو چکے ہیں۔ ارشاد اور طفیل نے فوراً سے پیشتر کھارا اور زیبو کو پہچان لیا۔ انہوں نے کھیت سے باہر نکل کر شور مچایا تو کھیتوں میں کام کرنے والے افراد وہاں جمع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے زیبو اور کھارا کی موت کی خبر، جنگل کی آگ کی طرح پورے منڈھورا کلاں میں پھیل گئی اور ...... اب وہ لوگ میرے سامنے تھے!

میں نے ایک تانگے کا بندوبست کرایا اور فوراً منڈھورا کلاں کی جانب روانہ ہو گیا۔ اب کی بار اے ایس آئی نیک محمد بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ لوگ بھی ایک تانگے ہی میں تھانے پہنچے تھے۔ ان کا تانگا ہمارے تانگے کے پیچھے منڈھورا کلاں کی سمت رواں دواں تھا۔

بدن کے آرپار ہونے والی چلچلاتی دھوپ میں، میں نے جائے وقوعہ کا جائزہ لیا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا جس کھیت سے زیبو اور کھارا کی لاشیں ملی تھیں وہ کھیت نہر کے کنارے کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ کھیت اور نہر کے درمیان ایک کچا راستہ تھا جس پر عموماً تانگوں، ریڑھوں، بیل گاڑیوں، سائیکل سواروں اور مال مویشی کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔ ہم بھی اسی راستے پر سفر کرتے ہوئے منڈھورا کلاں پہنچے تھے۔

میں نے دونوں لاشوں کا معائنہ کیا تو مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ زیبو اور کھارا کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ لاشوں کی حالت بتاتی تھی کہ ان دونوں کو تین چار روز پہلے قتل کر کے کھڑی فصل کے اندر پھینک دیا گیا تھا۔ قاتل جو کوئی بھی تھا وہ مضبوط ہاتھ پاؤں کا مالک ایک طاقت ور شخص تھا ورنہ اتنی آسانی سے دو انسانوں کی جان لینا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی جبکہ ان دو افراد میں ایک نوجوان مرد بھی ہو......!

میں موقعِ واردات کی کارروائی مکمل کر چکا تو نیک محمد تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے نزدیک آ گیا۔ اس کے چہرے سے دبا دبا جوش جھلک رہا تھا۔ اس نے ایک چیز

میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ دیکھیں ملک صاحب......!''

میں نے دیکھا۔ وہ چاندی کا ایک لاکٹ تھا جس کی زنجیر ٹوٹ کر لٹک رہی تھی۔ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟''

میری حیرت اور استعجاب کا سبب یہ تھا کہ وہ ایک غیر معمولی سائز کا لاکٹ تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق کم وبیش پچاس قیراط کا ایک یمنی عقیق اس لاکٹ میں جڑا ہوا تھا۔ یہ عقیق مستطیل شکل کا تھا۔ لاکٹ اور اس کی زنجیر خالص چاندی سے بنے ہوئے تھے اور...... وہ زنجیر ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی!

''یہ مجھے ادھر سے ملا ہے۔'' نیک محمد جائے واردات کے نزدیک ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے لگتا ہے اس لاکٹ کا قاتل کے ساتھ کوئی کنکشن ضرور ہے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے نیک محمد!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس لاکٹ پر بھی ریسرچ کرتے ہیں، پہلے ان لاشوں کو سرکاری اسپتال پہنچانے کا بندوبست کرنا ہوگا۔ اب تو ان سے بدبو بھی اٹھنے لگی ہے۔''

وہ لاشیں تین چار روز سے اس کھیت کے اندر پڑی تھیں، اوپر سے گرمی کا موسم۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہاں کیا عالم ہوگا۔ تیار کھڑی پکی ہوئی فصل چاہے گندم کی ہو یا چاول کی، اناج کی ایک مخصوص بو کھیتوں کے بیچوں بیچ سرسراتی رہتی ہے۔ اس بو کو فضا میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ گرم موسم اس کی شدت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ لاشوں کی بدبو بہت دور تک نہیں پھیل سکی تھی۔ یہ بدبو فصل کی مخصوص بو میں سرایت کرکے اپنی مخصوص ناگوار شناخت کھو بیٹھی تھی۔

میں نے دونوں لاشوں کو ایک تانگے پر لدوایا اور پوسٹ مارٹم کے لیے نیک محمد کی نگرانی میں ضلعی اسپتال روانہ کردیا۔ اس کے بعد میں موقع پر موجود افراد کی جانب متوجہ ہوگیا۔ جیرا تیلی، غلام سرور، طفیل اور ارشاد بھی ان افراد میں شامل تھے۔ میں نے ٹوٹی ہوئی زنجیر والا وہ لاکٹ ان سب کو دکھانے کے بعد پوچھا۔

''تم میں سے کوئی اس لاکٹ کو پہچانتا ہے؟''

''یہ تو میں نے سینڈو کے گلے میں دیکھا تھا۔'' ایک شخص نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔

''کون سینڈو......؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''وہ جی...... ادھر سرکس میں کام کرتا ہے۔'' ایک دوسرے شخص نے جواب دیا۔ ''وہ سرکس میں مختلف کرتب دکھاتا ہے۔ اس کا بدن گینڈے کی طرح مضبوط اور ربر کے مانند لچکیلا ہے جناب۔ وہ اپنے جسم کو بہت چھوٹے سے آہنی کڑے میں سے نکال کر خوب داد وصول کرتا ہے۔''

''سینڈو'' کا کردار ہر سرکس کا لازمی حصہ ہے۔ سینڈو کے نام سے جانا جانے والا یہ قوی الجثہ شخص سرکس میں مختلف کھیل تماشے دکھاتا ہے جن میں سے ایک خاص آئٹم چھوٹے سے آہنی کڑے میں سے اپنے جسم کو نکالنا بھی ہے۔ سینڈو کا نام سامنے آنے سے بہت سی ڈھکی چھپی باتیں بھی واضح ہوگئی تھیں۔ زیبو اور کھارا کو گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتارنے والا قاتل سینڈو جیسا تندرست اور توانا ہی ہوسکتا تھا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ لاکٹ تم نے سرکس میں کام کرنے والے سینڈو کے گلے میں دیکھا تھا؟'' میں نے اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا جس نے لاکٹ کو شناخت کیا تھا۔

''جی، مجھے پکا یقین ہے۔'' وہ ٹوٹی ہوئی زنجیر والے لاکٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میری آنکھیں دھوکا نہیں کھاسکتیں تھانے دار صاحب۔ یہ وہی لاکٹ ہے جو ہر وقت سینڈو کے گلے میں جھولتا رہتا تھا لیکن......!''

وہ اچانک بولتے بولتے رک گیا تو میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''لیکن کیا؟''

''لیکن یہ کہ......'' وہ بتانے لگا۔ ''سینڈو کئی دن سے سرکس میں نظر نہیں آرہا۔ پتا نہیں، وہ کہاں چلا گیا ہے......!''

اس انکشاف نے میرے وجود میں سنسنی سی دوڑادی۔ سینڈو کے غائب ہونے کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ دو افراد کے قتل میں ملوث تھا۔ لوبرڈز کے قاتل کی نشاندہی ہوگئی تھی۔

''تم نے کب سے سینڈو کو سرکس میں نہیں دیکھا؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''یہی کوئی...... تین چار دن سے جناب۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

میرے لیے کھیتوں میں کھڑے رہنا اب کسی بھی طور ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں میلے کا رخ کیا اور مذکورہ سرکس پہنچ گیا۔ سرکس کے مالک کا نام سلطان تھا۔ سرکس کے کھیل تماشے شام میں شروع ہوتے تھے اس لیے

اس وقت سلطان فری تھا اور اپنے خیمے میں آرام کر رہا تھا۔ میں نے سلطان کو مختصر الفاظ میں حقیقتِ حال سے آگاہ کیا اور پوچھا۔

"سینڈو کہاں ہے؟"

"چار دن پہلے وہ اپنے گھر چلا گیا ہے۔" سلطان نے جواب دیا۔ "لیکن مجھے یقین نہیں آرہا کہ سینڈو نے دو انسانوں کی جان لی ہے......!" اس کی آنکھوں میں الجھن بھری حیرت جھلک رہی تھی۔

"تمہارے یقین نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا سلطان۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے بتاؤ کہ ایسی کون سی آفت آگئی تھی جو وہ چلتے ہوئے سرکس کو چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا ہے؟"

"وہ کافی دنوں سے گھر جانے کے لیے مجھ سے چھٹی مانگ رہا تھا۔" سلطان نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "اور میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ابھی اسے چھٹی نہیں مل سکتی۔ جب ہم منڈھورا کلاں سے سرکس سمیٹیں گے تو پھر وہ جی بھر کے چھٹی کرلے۔ پتا نہیں، میری بات اس کی سمجھ میں آئی کہ نہیں۔ وہ ایک رات چپ چاپ سرکس سے غائب ہوگیا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ اپنے گھر چلا گیا ہے۔"

میں چونک اٹھا۔ "مطلب یہ کہ وہ جاتے ہوئے تم سے مل کر بھی نہیں گیا؟" میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"سینڈو کون سی تاریخ کو غائب ہوا تھا؟"

"بائیس مئی کی شام کو۔" اس نے جواب دیا۔

یہ وہی تاریخ تھی جب زیبو شام میں اپنی دو سہیلیوں رفعت اور فریدہ کے ہمراہ میلا دیکھنے گئی تھی اور سرکس کے قریب اس نے کھارا سے ملاقات کی تھی۔ اس کے بعد زیبو کا شمار گمشدہ افراد میں ہونے لگا تھا۔ اس سے یہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ زیبو اور کھارا کی جانوں کا ہتھیارا صرف اور صرف سینڈو ہی ہوسکتا تھا۔

"یعنی تم پورے اعتماد کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ سینڈو اپنے گھر ہی گیا ہوگا؟" میں نے سرکس کے مالک سلطان سے پوچھا۔

"یہ بات میں نے حالات و واقعات کی روشنی میں کہی ہے تھانے دار صاحب۔ وہ مجھ سے گھر جانے کی چھٹی مانگ رہا تھا اس لیے میں نے یہ سمجھ لیا، وہ اپنے گھر چلا گیا ہوگا۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "حقیقت کیا ہے، یہ تو

لطائف

لڑکی۔ "تم مجھ سے کتنا پیار کرتے ہو؟"

لڑکا۔ "میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔"

لڑکی۔ "پھر بھی کتنا؟"

لڑکا۔ "یوں سمجھو کہ میں موبائل فون اور تم میری "سم" ہو۔ پھر لڑکے نے مزید کہا۔

"تمہارے بغیر میں بیکار ہوں۔"

لڑکی۔ "اوہاؤ سویٹ...... آئی لو یو سو مچ!"

لڑکا دل میں بولا۔ "پاگل کہیں کی! اسے کیا پتا چائنا موبائل میں چار سمیں چلتی ہیں۔"

☆☆☆

ڈاکٹر: آپ کے شوہر کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ یہ نیند کی گولیاں ہیں۔

بیوی: یہ میں انہیں کس وقت دوں؟

ڈاکٹر: یہ آپ نے کھانی ہیں!

☆☆☆

اردو کا ٹیچر: بتاؤ یہ کون سا زمانہ ہے؟ میں ناچ رہا ہوں، تم ناچ رہے ہو، سب ناچ رہے ہیں۔

شاگرد: سر! خالص بے غیرتی کا زمانہ ہے!

☆☆☆

مریض: ڈاکٹر صاحب دو سال پہلے مجھے بخار ہوا تھا۔

ڈاکٹر: تو اب کیا ہوا؟

مریض: تب آپ نے نہانے سے منع کیا تھا۔ پوچھنا ہے کہ اب نہالوں یا......؟

(مرسلہ: سنعیہ منظور، یوحنا آباد، لاہور)

☆☆☆

ایک گاؤں میں کسی بزرگ کا انتقال ہوا تو اس کی وجہ سے اسکول میں بچوں کی چھٹی ہوگئی۔

دوسرے دن بچوں نے دو بزرگوں کو دیکھا تو ایک بچہ بولا۔

"دیکھو دو اور چھٹیاں گھوم رہی ہیں۔"

(مرسلہ: محمد شہباز ناز، ضلع سرگودھا)

صرف خدا ہی جانتا ہے۔"
سلطان کی بات میں وزن تھا۔ میں نے کہا۔
"حقیقت سے پردہ میں خود اٹھالوں گا۔ تم مجھے سینڈو کے گھر کا پتا بتاؤ......؟"
"سینڈو پنڈی بھٹیاں کا رہنے والا ہے۔" سلطان نے بتایا۔
"پنڈی بھٹیاں خاصا وسیع علاقہ ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں پنڈی بھٹیاں کے ایک ایک گھر میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتا کہ سینڈو وہاں رہتا ہے یا نہیں۔ مجھے اس کے گھر کی ٹھیک ٹھیک لوکیشن بتاؤ۔"
سلطان نے میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

☆☆☆

ستائیس مئی کی صبح بڑی خوشگوار اور پُرسکون تھی۔ میں مطمئن ذہن کے ساتھ تیار ہو کر تھانے پہنچا تو خادم حسین نے سینڈو کو میرے سامنے پیش کر دیا۔ گزشتہ روز، رات گئے میں نے پنڈی بھٹیاں سے سینڈو کو گرفتار کر لیا تھا اور تھانے پہنچا کر اسے حوالدار خادم حسین کی تحویل میں ان احکامات کے ساتھ دے دیا تھا۔
"خادم حسین! رات کا جتنا وقت باقی ہے، یہ تمہاری حوالداری کی آزمائش کے لیے کافی ہوگا۔ صبح یہ بندہ مجھے ٹیپ کی طرح فر فر بولتا ہوا ملنا چاہیے۔"
"ملک صاحب! ٹیپ ریکارڈ حاضر ہے۔" خادم حسین نے سینڈو کو میرے سامنے پیش کرتے ہوئے بڑے فخر سے بتایا۔ "آپ پلے کا بٹن دبائیں۔ یہ فر فر بولنے لگے گا۔"
"کیا اس نے دہرے قتل کا اقبال کر لیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"جی ملک صاحب۔" حوالدار سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "آپ کو پتا ہے، میری حوالداری تو پتھروں کو بولنے پر مجبور کر دیتی ہے، یہ تو گوشت کا پہاڑ ایک انسان ہے۔ بس، اس نے میری فرمائش پوری نہیں کی......"
حوالدار نے معنی خیز انداز میں اپنی بات پوری کی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "تم نے سینڈو سے ایسی کون سی فرمائش کر دی تھی؟"
وہ اپنی جیب میں سے چوڑی کے سائز کا ایک آہنی کڑا برآمد کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بڑا سینڈو بنا پھرتا ہے نا۔ میں نے اس سے کہا، تم سرکس میں لوہے کے کڑے میں سے اپنے بدن کو گزارتے ہو۔ تمہاری کاریگری کو میں تو اس وقت مانوں گا جب تم سرکس کے باہر یعنی حوالات میں میری نگاہ کے سامنے خود کو اس کڑے کے اندر سے گزار کر دکھاؤ گے۔" بات کے اختتام پر خادم حسین نے چوڑی کی گولائی والے آہنی رنگ کو فضا میں لہراتے ہوئے اضافہ کیا۔ "اس کڑے میں سے ملک صاحب......"
حوالدار کی بات سن کر میرے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "تو اس نے تمہاری فرمائش پوری نہیں کی......؟"
"نہیں جناب۔" خادم حسین نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "حالانکہ آپ دیکھ لیں، میں نے اس کے بدن پر کتنا تیل مل رکھا ہے تاکہ میرے فراہم کردہ کڑے میں سے خود کو گزارتے ہوئے اسے کسی دقت کا سامنا نہ ہو......"
خادم حسین بالکل درست کہہ رہا تھا۔ سینڈو کے جسم پر اس وقت لباس کے نام پر صرف ایک جانگیا تھا اور واقعتاً اس کا پورا بدن تیل سے چمک رہا تھا۔ اس چمک میں پسینے کی فراوانی بھی شامل تھی۔ میں نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ ایک غیر سنجیدہ استفسار کیا۔
"اوئے نامعلوم سینڈو کی نالائق اولاد! ادھر سرکس میں تو تم بڑے کمالات دکھاتے ہو۔ میرے حوالدار کی ایک چھوٹی سی فرمائش تم سے پوری نہ ہو سکی؟"
"تھانے دار صاحب! آپ خود سوچیں......" سینڈو عاجزانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "میں اپنے بدن کو اس چوڑی میں سے کیسے گزار سکتا ہوں؟"
"جب تم دو جیتے جاگتے انسانوں کو زندگی سے گزار سکتے ہو تو پھر اپنے ناپاک بدن کو چوڑی میں سے کیوں نہیں گزار سکتے۔" میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ "یہ تسلیم کرتے ہو نا کہ تم ہی نے زیبو اور کھارا کو موت کے گھاٹ اتارا ہے؟"
"جج...... جی......!" اس نے ندامت بھرے انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔
"کیوں......!" میں نے کڑک لہجے میں استفسار کیا۔ "تمہاری ان دونوں سے کیا دشمنی تھی؟"
"کوئی نہیں جی......" وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ "میں تو انہیں جانتا تک نہیں تھا۔ میں منڈھورا کلاں میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"
"پھر تم نے ان بدنصیبوں کے خون میں ہاتھ کیوں رنگے؟" میں نے پھنکار سے مشابہ آواز میں پوچھا۔

''وہ...... جی ...... میں لالچ میں آ گیا تھا......'' وہ ہچکچاہٹ بھرے انداز میں بولا۔

میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''دولت کا لالچ نا......؟''

''بس جی ...... تین ہزار روپے کا ذکر سن کر میرے دل میں لالچ پیدا ہو گیا تھا۔'' وہ اقبالِ جرم پر اپنے بیان کی تصدیقی مہر ثبت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس شام سرکس کے تنبو کے نزدیک ان دونوں کو باتیں کرتے سن لیا تھا۔ اس وقت میں تنبو کے اندر اپنے آئٹم کی تیاری کر رہا تھا اور ان کی آواز بڑے واضح طور پر مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ ان کی باتوں سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ وہ فرار کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ میں نے ان کی ساری پلاننگ سن لی۔ لڑکی نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ واپس گھر کی طرف جانا تھا لیکن گھر میں داخل ہونے کے بجائے واپس میلے میں آ جانا تھا۔ جس میدان میں یہ میلا لگا ہوا ہے، اس کے آخری کنارے پر نہر کی پلیا ہے۔ لڑکے نے وہاں بیٹھ کر لڑکی کا انتظار کرنا تھا۔ لڑکی کو میلے کے اندر سے گزرتے ہوئے اس پلیا تک پہنچنا تھا۔ پھر اندھیرا پھیلتے ہی وہ دونوں ایک نئی زندگی کی تلاش میں کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو جاتے۔ مجھے ان کی منزل کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اور لڑکے نے ایسا کوئی ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ ان کی ساری گفتگو میں میری توجہ صرف ایک ہی نکتے پر لگی ہوئی تھی......''

''کون سا نکتہ؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

''ان دونوں کے پاس تین ہزار روپے کی ایک تگڑی رقم موجود تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''دو ہزار روپے لڑکی اپنے گھر سے چرا کر لائی تھی اور ایک ہزار روپے لڑکے نے کہیں سے مارے تھے۔ بس جناب ...... اس رقم کے حصول کے لیے میں لالچ میں آ گیا تھا۔ میں نے سرکس کو خیرباد کہا اور ان سے پہلے ہی نہر والی پلیا کے نزدیک کھڑی فصل میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ پھر جب وہ دونوں یکے بعد دیگرے اس پلیا پر پہنچے تو میں نے اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے ان دونوں کو قتل کر دیا اور ان کی لاشوں کو کھیتوں میں چھپا کر میں رفوچکر ہو گیا۔''

''تم اس رقم کو ہتھیانے کے لیے لالچ میں آ گئے تھے اور قانون تمہیں قرار واقعی سزا دینے کے لیے حرکت میں آ چکا ہے۔'' میں نے تند لہجے میں کہا۔ ''اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں پھانسی لگنے سے نہیں بچا سکتی...... کیا سمجھے؟''

''جناب! میں لوٹی ہوئی رقم میں سے دو ہزار روپے واپس کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ ہوشیاری سے بولا۔ ''آپ کوئی ہلکی دفعہ لگا کر مجھے پھانسی سے بچا لیں۔ میں جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔''

وہ مجھے ہلکی دفعہ لگانے کے لیے دو ہزار روپے رشوت کی پیشکش کر رہا تھا۔ اسے قطعاً علم نہیں تھا کہ ملک صفدر حیات دو ہزار کیا، دو لاکھ یا کروڑ میں بھی بکنے والا نہیں تھا۔ میں نے اس کا ذہن پڑھنے کے لیے کھسائی کا عمل جاری رکھا۔

''دو ہزار روپے کیوں؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''تم نے تو ان مقتولین سے پورے تین ہزار روپے لوٹے تھے......!''

''وہ جی ...... ایک ہزار روپے میں نے خرچ کر دیے ہیں۔''

''تم نے چار دن میں ایک ہزار روپے خرچ کر ڈالے۔'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ایسا کیا خرید لیا تم نے؟''

''خریدا تو کچھ نہیں تھانے دار صاحب......!''

''پھر ایک ہزار روپے کہاں چلے گئے؟''

''میں پنڈی بھٹیاں میں تین چار لوگوں کا مقروض تھا'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جیسے ہی پیسے میرے ہاتھ میں آئے، میں نے سب سے پہلے قرض ادا کیا۔ اب باقی دو ہزار روپے بچے ہیں۔ اگر آپ مجھے پھانسی سے بچا لیں تو یہ دو ہزار روپے میں آپ کو دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''یہ دو ہزار روپے تو میں تم سے ضرور وصول کروں گا لیکن اپنے لیے نہیں۔'' میں نے اس کی خوش فہمی کا جنازہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رقم جائے گی اس کے اصل حق داروں کے پاس البتہ تمہارے لیے میرے پاس ایک تحفہ ہے......''

''تحفہ......!'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''کیسا تحفہ؟''

''تم نے دو انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا سنگین جرم کیا ہے سینڈو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس جرم کی پاداش میں تمہیں پھانسی پر تو لٹکنا ہی پڑے گا۔ میں تمہیں اس عظیم کارنامے پر موت کا تحفہ پیش کرتا ہوں۔''

وہ رونے گڑگڑانے لگا، اپنی جان بخشی کے لیے میری منت سماجت کرنے لگا لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی

اور حوالدار خادم حسین سے کہہ کر اسے حوالات میں بند کروا دیا۔ اسی روز میں نے اس کی نشان دہی پر دو ہزار روپے بھی برآمد کرالیے۔

اگلی صبح میں نے بڑے مضبوط چالان کے ساتھ اسے عدالت میں پیش کر دیا۔ سینڈو میری تحویل میں اپنے جرائم کا اقبال کر چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس سے وصول ہونے والی رقم اس درخواست کے ساتھ عدالت میں چالان کے ہمراہ جمع کرادی۔

''میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ وہ اس رقم کو جلد از جلد ریلیز کر دے تاکہ مقتولین کے ورثا کی حتی المقدور اشک شوئی کی جاسکے۔''

پہلی ہی باقاعدہ پیشی پر عدالت نے مذکورہ رقم میرے حوالے کردی تاکہ میں اسے حق داروں تک پہنچا سکوں۔ اگلے روز میں نے غلام سرور اور جیرا تیلی کو تھانے بلالیا۔ اس دوران میں زیبو اور کھارا کو منڈھورا کلاں کے قبرستان میں منوں مٹی کے نیچے دبایا جاچکا تھا۔

ان دونوں کی حالت قابلِ افسوس ہو رہی تھی۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیا اور معذرت آمیز ہمدردی سے کہا۔

''مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میں زیبو اور کھارا کو زندہ سلامت تم تک نہیں پہنچا سکا لیکن اس امر پر میرا ذہن مطمئن ہے کہ میں نے ان دونوں کے قاتل سینڈو کو ایک مضبوط کیس کے ساتھ جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا ہے۔ ایک آدھ پیشی میں اس کے لیے پھانسی کے احکامات صادر ہو جائیں گے لیکن میں نے تم دونوں کو اس وقت ایک خاص مقصد کے لیے یہاں بلایا ہے۔''

ان دونوں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

میں نے اپنی میز کی دراز میں سے دو بھورے رنگ کے لفافے برآمد کرتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں کی ایک ایک امانت میرے پاس رکھی ہے۔ یہ میں تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ دونوں بہ دستور الجھن زدہ نظروں سے مجھے تکے جارہے تھے۔ میں نے ایک ایک بھورا لفافہ ان کی طرف بڑھا دیا۔

غلام سرور والے لفافے میں ایک ہزار تین سو چونتیس روپے اور جیرا تیلی والے لفافے میں چھ سو چھیاسٹھ روپے موجود تھے۔ سینڈو نے لوٹی ہوئی رقم میں سے ایک ہزار ٹھکانے لگا دیے تھے، باقی جو دو ہزار روپے بچے تھے، اس رقم میں ان دونوں کا حسابی نسبت تناسب کے اصول کے مطابق یہی حصہ بنتا تھا جو میں نے ان کے حوالے کر دیا تھا۔

ان دونوں نے اپنا اپنا لفافہ کھول کر رقم گنی پھر غلام سرور نے تیکھے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! کیا یہ پیسے میری زیبو کی زندگی کا نعم البدل ہو سکتے ہیں؟''

''میں کاغذ کے ان ٹکڑوں کا کیا کروں گا؟'' جیرا تیلی دکھی لہجے میں بولا۔ ''میرا جوان جہان بیٹا چلا گیا۔ یہ پیسے میرے درد کا مداوا نہیں بن سکتے۔''

''میں تم دونوں کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور مانتا ہوں کہ یہ رقم زیبو اور کھارا کو زندگی کی طرف واپس نہیں لا سکتی لیکن ایسے ہی مواقع پر انسان کی بے بسی اور لاچاری بتاتی ہے کہ سب کچھ اس کے بس میں نہیں ہے۔ بہت سارے دیگر معاملات کی طرح زندگی اور موت کا معاملہ بھی قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر نہ تو کوئی زندگی اس دنیا میں آنکھ کھول سکتی ہے اور نہ ہی موت کسی انسان کی زندگی کو چاٹ سکتی ہے۔ اس کی مشیت کے سامنے سب مجبور ہیں۔''

میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا بیان کردہ آفاقی فلسفہ جیرا تیلی اور غلام سرور کی سمجھ میں آیا تھا یا نہیں...... بہرحال ان دونوں نے مجھ سے کوئی جرح بحث نہیں کی اور بوجھل سینوں کے ساتھ واپس چلے گئے۔

میرا فلسفہ مبنی بر حقیقت تھا۔ انسان چاہے کتنا بھی طاقتور کیوں نہ ہو، اس کے اختیار کی ایک حد ہوتی ہے۔ سینڈو کے پاس جسمانی طاقت کی کمی نہیں تھی۔ وہ چھوٹے سے آہنی رِنگ میں سے اپنے گینڈا وجود کو گزار کر دکھاتا تھا، پھر بھی وہ موت کے شکنجے میں پھنسنے سے خود کو نہ بچا سکا۔ میرے پاس قانون کی لامحدود طاقت موجود تھی مگر میں اس اختیار کو استعمال کر کے زیبو اور کھارا کو زندگی ایسی نعمت سے سرفراز نہیں کر سکتا تھا۔ ہم میں سے ہر کوئی اپنی اپنی حیثیت میں اس ''طاقت ور'' کی قدرت کے سامنے مجبور تھا۔ اگر وہ مالک و خالق و رازق ایسا ہی طاقتور اور قادرِ مطلق نہ ہوتا تو انسان اسے کبھی خدا تسلیم نہ کرتا!

میری توقع کے عین مطابق، آئندہ پیشی پر سینڈو کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ یہ پتا نہ چل سکا کہ ''مرحوم لَو برڈز'' نے کس سمت پرواز کی ٹھانی تھی......!

(تحریر: حُسام بٹ)